پھول کی تنہائی
کرشن چندر

پھول کی تنہائی

کرشن چندر کی دیگر کتب

۱- الٹا درخت
۲- محبت کی رات
۳- مضامین کرشن چندر
۴- ایک گدھے کی سرگذشت
۵- مسکرانے والیاں
۶ - میری یادوں کے چنار
۷- نئے غلام
۸- دادر پل کے بچے
۹- کرشن چندر کے ڈرامے
۱۰- پہلگام کا بدنام
۱۱- طوفان کی کلیاں
۱۲- گنگا بہے نہ رات
۱۳- کشمیر کی کہانیاں
۱۴- اجنتا سے آگے
۱۵- دل کسی کا دوست نہیں
۱۶- دسواں پل

پھول کی تنہائی

کرشن چندر

مکتبہ اُردو ادب
بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ، لاہور

ناشر ——————— سرفراز احمد

مطبع ——————— پریس لاہور

قیمت ——————— -/۱۵ روپے

ترتیب

پالنا

میرے ہاتھ میں ایک عینک ہے۔ لوگ اسے عینک کہتے ہیں۔ مگر میرے خیال یہ صرف کانچ کے ٹکڑے ہیں۔ جو پلاسٹک کی کمانی میں اس طرح پھنسا دیئے گئے ہیں جس طرح سماج کی کمانی میں انسان کی زندگی پھنسا دی جاتی ہے۔ یہ زندگی ٹوٹ سکتی ہے مگر اس کمانی سے باہر نہیں نکل سکتی۔ یہی حال ان کانچ کے دو ٹکڑوں کا ہے۔

مگر پلاسٹک کی کمانی میں پھنسے ہوئے کانچ کے یہ ٹکڑے معمولی بھی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جب میں انہیں اپنی آنکھوں پر رکھتا ہوں تو میری آنکھوں کو سب کچھ نظر آنے لگتا ہے وہ سب کچھ جو اس سے پہلے نظر نہ آتا تھا یا موہوم، مبہم اور پُراسرار دکھائی دیتا تھا۔ پھیلا۔ پھیلا دُھندلکوں میں لپٹا ہوا۔ عینک لگانے پر سب کچھ صاف صاف نظر آنے لگتا ہے۔ جیسے دُھند چھٹ گئی ہو۔ غبار دُھل گیا ہو اور ہر چیز فوکس میں ہو۔ میرے خیال میں کانچ کے ٹکڑوں کا کوئی اور فائدہ ہو نہ ہو، یہ فائدہ تو ضرور ہے کہ یہ ٹکڑے انسان کی آنکھوں کو ٹھیک کر دیتے ہیں۔ یوں تو ہر انسان کے پاس آنکھیں ہوتی ہیں۔ آنکھوں میں نظر ہوتی

ہے۔ مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان آنکھیں ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھتا۔ نگاہ ہوتے ہوئے بھی اندھا رہتا ہے اور ایسا محسوس کرتا ہے جیسے اس کے چاروں طرف اونچی دیواریں ہوں اور بیچ میں اندھیرا ہو؟

مگر یہ کانچ کے ٹکڑے بڑے عجیب ہیں۔ یہ دیواروں کے آرپار دیکھ لیتے ہیں۔ جہاں اندھیرا ہوتا ہے وہاں روشنی کر دیتے ہیں۔ یہ چاہیں تو وقت تھم جائے۔ آگے بہنے لگے یا پیچھے چلنے لگے۔ جب نظر ان ٹکڑوں میں سے گزرتی ہے تو روشنی سے زیادہ تیز رفتار ہوتی ہے۔ وہ کبھی تو ساری کائنات کا احاطہ کر لیتی ہے۔ اور کبھی ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتی ہے۔

میں ہر روز صبح کا اخبار کانچ کے انہی ٹکڑوں کی مدد سے پڑھتا ہوں۔ مگر ان کا برتاؤ میری آنکھوں سے عجیب سا ہوتا ہے۔ مثلاً میں آج صبح کے اخبار میں پردھان منتری کی تقریر پڑھنا چاہتا تھا۔ مگر یہ کانچ کے ٹکڑے شاید کچھ اور ہی پڑھنا چاہتے تھے۔ میں نے جوں ہی پردھان منتری کی تقریر پڑھنی شروع کی۔ میری نظر کے نیچے سے اخبار کے الفاظ پھسلنے لگے۔ پگھل کر اپنی شکل کھونے لگے۔ اور بڑے بڑے دائرے بن کر میری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے۔

میں نے پریشان ہو کر وہاں سے نظر ہٹا لی۔ سوچا چلو پردھان منتری کی تقریر نہ سہی کوئی دوسری خبر ہی پڑھیں گے۔ ذرا معلوم کریں افریقہ میں کیا ہو رہا ہے؟ یہ جاننے کے لیے میں نے اخبار کا صفحہ پلٹا تو میری نگاہ پھسلتے پھسلتے، افریقہ کی خبر سے بھی ایک تصویر پر آ کر رک گئی اور کانچ کے ٹکڑے فوکس میں آ گئے۔ یہ افریقہ کے کسی بڑے نیتا کی تصویر نہ تھی۔ یہ دریا گنج کے ایک یتیم خانہ کی تصویر تھی۔ جس کے باہر ایک پالنا

لٹکا ہوا تھا۔

تاکہ لوگ حرامی بچوں کو کسی گندی موری میں ڈالنے یا کوڑے کرکٹ کے کسی ڈھیر پر پھینکنے کی بجائے اس پالنے میں رکھ جائیں! کس قدر عمدہ اور نیک خیال آیا تھا کسی کو! جس کسی نے یہ ترکیب نکالی اس کے ذہن رسا کی داد نہ دینا بڑا ظلم ہوگا۔

میں نے پلک جھپکا کر بڑے غور سے اِس پالنے کی طرف دیکھا اور پلک جھپکتے ہی میں وہاں موجود تھا۔

پکّے رنگ کی ایک عورت اس پالنے میں ایک بچّہ رکھ کر اور گھنٹی بجا کر جلدی سے واپس جا رہی تھی۔

"ارے ـــــ ارے ـــــ ٹھہرو!"

میں نے اُس سے چلّا کر کہا مگر وہ تیزی سے دوڑی اور نکڑ پر جا کر غائب ہو گئی۔ میں نے پالنے میں پڑے ہوئے بچّے کی طرف دیکھا اور دوسرے لمحہ میں اس عورت کی طرف دوڑا اور دوسری گلی کے آخری سِرے پر اُسے جا لیا۔

وہ ہانپتی کانپتی ایک ڈرگ سٹور کے خالی برآمدے میں بیٹھ گئی۔ مجھے قریب آتے دیکھ کر اس کی گبھراہٹ اور پریشانی میں دم بدم اضافہ ہو رہا تھا۔ میں نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔

"تمہیں شرم نہیں آتی؟ اپنا بچہ اس پالنے میں چھوڑ آئی ہو؟"

مگر بالکل قریب پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ میرا اُس پر یوں سوال کرنا ٹھیک نہ تھا۔ کیونکہ وہ عمر کے اس حصّے سے گزر چکی تھی۔ جس میں بچے پیدا ہوتے ہیں۔

اُس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ وہ بے حد گبھرا چکی تھی۔

اُس نے میرے دونوں پاؤں پکڑ لیے اور ان پر سر رکھ دیا۔

"کس کا بچہ ہے؟"

میں نے کڑک کر پوچھا۔

"میری بیٹی کا"

وہ روتے ہوئے بولی۔

"کہاں رہتی ہو؟"

"مسر کی دالان کی گلی میں!"

"بچے کو واپس لے جاؤ۔۔۔!"

"نہیں لے جاسکتی"

بوڑھی عورت نے روتے روتے اپنا سر اٹھالیا۔

"ابھی تو اپنی بیٹی کو بھی محلے میں واپس نہیں لے جاسکتی۔ لوگ کیا کہیں گے اور برادری کیا کہے گی؟"

"میری بیٹی کنواری ہے۔ اس کے باپ کو تو بچہ پیدا ہونے کا علم ہی نہیں ہے اسے معلوم ہوگا تو میری بیٹی کو جان سے مار ڈالے گا"

"اور وہ بدمعاش کہاں ہے جس نے ـــــ جس نے ـــــ؟"

"اس نے اپنا تبادلہ دہلی سے باہر کرالیا ہے! پہلے تو کہتا تھا کہ شادی کرلوں گا پھر چپکے سے تبادلہ کرا کے مدارس چلا گیا"

"تو اُسے مدارس میں جاکر پکڑ لو، اس پر مقدمہ کر دو!"

"کتنی بدنامی ہوگی بیٹا؟ سارے خاندان کی ناک کٹ جائے گی۔ ذرا

سوچو تو میری بیٹی کنواری ہے۔ ابھی کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے میں کسی دوسری جگہ اس کی شادی کر سکتی ہوں!"

میں اس بوڑھی عورت کے پاس بیٹھ گیا اور اُسے بڑے میٹھے لہجہ میں سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

"ذرا سوچو تو ماں! تم اُس بچے کی نانی ہو نانی! وہ تمہارا نواسہ ہے۔ زندگی بھر شاید تم نے نواسے کو گود میں کھلانے کا خواب دیکھا ہوگا۔ اور آج تم اُسے یتیم خانے کے پالنے میں چھوڑ آئی ہو۔ ذرا سوچو ماں، تمہاری بیٹی کا بچہ کن حالات میں پلے گا؟"

"میں تم سے کہتا ہوں ماں! تم اس بچے کو واپس لے جاؤ۔ اُسے ماں کا پیار دو۔ نانی کا لاڈ اور چاؤ دو۔ اُسے بھی تمہارے گھر میں جینے کا اتنا ہی حق ہے جتنا تمہاری بیٹی کو۔"

"رہا تمہاری بیٹی کی شادی کا سوال، سو ہمارا دیش اب جاگ اُٹھا ہے۔ آج تمہیں ہزاروں روشن خیال نوجوان ایسے مل جائیں گے جو تمہاری بیٹی کی دردناک داستان سے متاثر ہو کر اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔"

بڑی اچھی تقریر تھی۔ اس وقت میں خود بھی اس تقریر سے اس قدر متاثر ہوا کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میری تقریر سن کر اس بوڑھی عورت کے چہرے پر بھی رونق اور اس کی آنکھوں میں اُمید کی جھلک آ گئی۔

اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور میری طرف خوشی اور اُمید سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"بیٹا! کیا تم ـــــ تم ـــــ میری بچی سے شادی کر لوگے؟"

"میں ـــــ میں ـــــ؟" میں ایک دم گھبرا گیا۔ میری بات تو اور ہے میرا مطلب ہے کہ ـــ میری شادی ہو چکی ہے؟"

میں نے جھوٹ بول دیا۔

وہ بوڑھی عورت میری طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے اپنے سامنے کسی دوسرے حرامی بچّے کو دیکھ رہی ہو۔ وہ بہت دیر تک چُپ چاپ دیکھتی رہی۔ پھر جب میں نے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں تو اس نے ایک آہ بھر کر "ہائے رام" کہا اور وہ اپنے گھٹنوں کو بازوؤں کا سہارا دے کر اُٹھی اور میری طرف دیکھے بغیر چپ چاپ وہاں سے چل دی۔

میں پالنے کی طرف پلٹ آیا اور ایک ایسے کونے میں بیٹھ گیا۔ جہاں سے میں تو پالنے کو صاف دیکھ سکتا تھا لیکن کوئی دوسرا مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

مجھے اُس بڑھیا کے سوال پر بڑا غصّہ آیا تھا۔ اُونہہ! گناہ کوئی کرے اور سزا میں بھگتوں۔ عیش کرے دوسرا اور قیمت چکاؤں میں! ایسا احمق نہیں ہوں میں! پھر صاحب یہ کہاں کی تک ہے کہ جو کوئی اچھی تجویز سمجھائے اُسی کے پلے وہ تجویز باندھ دی جائے۔ میرا کہنے کا مطلب تو صرف یہ تھا کہ اس ملک میں سینکڑوں ہزاروں ایسے روشن خیال نوجوان ہوں گے جو ـــــ جو ـــــ میرا مطلب یہ نہیں کہ میں روشن خیال نہیں ہوں۔ مگر اب میں نے اپنے ذہن میں اپنی ہونے والی بیوی کی جو تصویر بنا رکھی ہے وہ اس لڑکی سے قطعی مختلف ہے!

لیکن مجھے اُن عورتوں پر بڑا غصہ آرہا تھا۔ جو ماں بن کر اپنی ممتا کو بھول جاتی

ہیں اور اپنے ننھے بچے کو ایک یتیم خانے کے پالنے میں چھوڑ جاتی ہیں ۔ میں نے سوچا ۔ آج میں دن بھر اس پالنے کی نگرانی کروں گا اور میں دن بھر میں ایک عورت کو بھی شرم دلا کے مجبور کر سکا کہ وہ اپنے بچے کو واپس لیجائے تو میرا دن ضائع نہ جائے گا ۔ لیکن مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا ۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ایک نوجوان لڑکی آئی اور گرم کپڑوں میں لپٹا ہوا ایک پارسل سا پالنے میں پھینک کر چلی گئی ۔ یکایک پارسل رونے لگا ۔

میں اس لڑکی کے پیچھے دوڑا ۔ وہ لڑکی مجھے دیکھ کر بھاگی اور گلی کے نکڑ پر ایک سائیکل سوار سے ٹکراتے ٹکراتے بچی ۔ آخر دو چار گلیوں سے گھومتی گھامتی وہ سامنے سے پلٹ کر پچھواڑے کی اس سڑک پر آئی جو دریا گنج میں شہر کی پرانی فصیل کے کنارے چلتی ہے ۔

وہ بار بار مڑ کر میری طرف دیکھتی جاتی تھی اور میں اس سے پچاس گز کا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے پیچھے اس طرح چل رہا تھا ۔ جیسے میں اس کا پیچھا کرنے کے لیے نہیں، بلکہ چہل قدمی کی غرض سے اپنے گھر سے نکلا ہوں ۔

دریا گنج سے باہر نکل کر وہ لڑکی فصیل کے باہر دیوار کے ایک کونے سے لگ کر کھڑی ہو گئی ۔ اس کے سامنے آصف علی مرحوم کا بُت تھا ۔ نمائش ہو رہی تھی اس لڑکی کے بالکل قریب بائیں طرف ایک گہری کھائی تھی ۔

دائیں طرف ایک فلم کا بہت بڑا اشتہار لگا ہوا تھا "دل اپنا، پریت پرائی" میں بڑے اطمینان سے سگریٹ سلگا کر اس لڑکی کے قریب پہنچ گیا ۔ وہ منہ پھیرے کھڑی تھی "ہیلو؟" میں نے آہستہ سے پوچھا ۔

پریت پرائی کا نتیجہ کیا نکلا؟"

وہ یکایک میری طرف گھومی اور مجھے شعلہ بار آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"اگر تم نے پیچھا کیا تو میں پولیس سے شکایت کر دوں گی!"

"میں بھی تو یہی چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلو۔ اور میری شکایت کر دو اور میں اس لڑکی کی شکایت کر دوں جو ابھی ابھی اپنا بچہ یتیم خانے کے پالنے میں رکھ کر آئی ہے۔"

"یہ سراسر جھوٹ ہے اس کا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟"

"ثبوت تو ڈاکٹر دیں گے!"

میں نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کی شرربار نگاہیں بجھ سی گئیں، جیسے بجلی کا سوئچ ایک دم آف ہو جائے خوبصورت سے چہرے پر اندھیرا سا چھا گیا اس کے پتلے پتلے ہونٹ کانپنے لگے اور دھیرے سے پوچھنے لگی۔

"تم کتنا روپیہ چاہتے ہو۔؟"

میں نے پوچھا "تم کتنا دے سکتی ہو؟"

ہمارے سامنے سے پولیس کا ایک سنتری ہمیں گھورتے ہوئے گذر گیا۔ وہ بے حد گھبرا گئی۔ بولی۔

"چلو موٹر میں چل کر بیٹھو، وہاں بات کریں گے۔"

تم! تو تم موٹر میں آئی ہو؟ میں نے دل ہی دل میں کہا اور اس کے ساتھ

ہولیا۔ اور ہم دونوں سامنے کا چھوٹا سا پارک کراس کرنے لگے۔ جس میں آصف علی مرحوم کا بُت تھا۔ جب میں اس کے ساتھ چل رہا تھا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ اُونچے پورے قد کی لڑکی ہے اور اس کی کمر بڑی دلکشی کے ساتھ لچکتی ہے بالوں سے شو نتی کے پھولوں کی مہک آتی ہے۔ اس کی ساڑھی کا کپڑا بے حد مہنگا ہے اس کی گاڑی کا ماڈل صرف دو سال پُرانا ہے۔

ہم دونوں پارک کراس کر کے سڑک کراس کر گئے اور اس کی موٹر میں پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ اس لڑکی نے اندر بیٹھ کر اپنے کانوں کی بالیاں اُتاریں۔ پھر اپنے ہاتھ کا منقش کنگن اُتارا۔ پھر اپنا پرس کھول کر اُس میں سے پانچسو روپے نکالے اور یہ سب کچھ میرے ہاتھ میں دے کر کہا۔

"لو سنبھالو یہ سب، اور میری جان بخشی کرو۔"

"یہ تو بہت کم ہے۔!"

میں نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"تو اور تم کیا لو گے؟"

مغرور اور بد مزاج لڑکی نے ذرا تیز لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے بچّے کو واپس لے جاؤ۔"

"ناممکن ہے۔ میں کنواری ہوں۔"

"کنواری تو نہیں ہو، یوں کہو کہ تم شادی شدہ نہیں ہو۔"

"اچھا یونہی سہی۔ پھر؟"

"پھر تم اس شخص سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں جس سے تمہیں ایسی شدید

محبت رہی ہے۔ تم بے حد حسین ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا" "تم سے شادی کیوں نہیں کرے گا۔"

"وہ تو کرنا چاہتا ہے مگر میں نہیں کرنا چاہتی۔"

وہ فیصلہ کُن لہجہ میں بولی۔

شاید تمہارے دل میں اس کے لیے محبت نہیں ہے؟

میں نے اس سے پوچھا۔

نہیں مجھے اس سے محبت ہے۔

"تمہیں اس سے محبت ہے؟" میں حیران ہو کر بولا۔

" وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے تو تم اس سے شادی کیوں نہیں کرتی؟"

"وہ غریب ہے اور میرا خرچ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"تو تم اپنا خرچ کم کر دو۔!"

"یہ ناممکن ہے۔"

وہ لڑکی فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"میری سب سہیلیوں نے بڑے بڑے لوگوں سے شادیاں کی ہیں۔ میں بھی ایسا ہی کروں گی۔ میں نئی دلی میں ایک بہت بڑی ملازمت پر کام کرتی ہوں۔ میں ایک غریب آدمی سے شادی کیوں کروں؟"

"آئی سی۔"

میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اچھا تم ایسا کرو کہ یہ بچہ جو تم دونوں کی محبت کا ثمر ہے اس کے باپ کو دے دو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسے تمہارے پیار کی آخری نشانی سمجھ کر ہمیں نہ ٹھکرائے گا۔"

"میں اسے یہ بچہ نہیں دے سکتی!"

"کیوں؟"

"کیونکہ یہ بچہ اس کا نہیں ہے جس سے مجھے محبت ہے۔!"

"جس سے تمہیں محبت ہے یہ اس کا بچہ نہیں ہے؟" میں حیرت سے بولا۔

"تو پھر کس کا بچہ ہے؟"

"یہ میرے ایک دوست کا بچہ ہے۔!"

"تو یہ تمہارا بچہ نہیں ہے؟"

یہ بچہ تو میرا ہے۔ لیکن اس کا نہیں ہے۔ جس سے مجھے محبت ہے۔

اس بچے کا باپ دراصل ایک بزنس مین ہے۔ جو میرا دوست ہے!"

"تو تم اس بزنس مین ہی سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ وہ تمہارا خرچ بھی یقیناً برداشت کر سکے گا۔ اور اس غریب بچے کو اس کا باپ بھی مل جائیگا۔"

"نہیں میں اس بزنس مین سے بھی شادی نہیں کر سکتی۔"

وہ لڑکی انتہائی سکون اور طمانیت سے بولی۔

"وہ مجھے پسند نہیں ہے۔"

"جو تمہیں پسند ہے اس کا یہ بچہ نہیں ہے اور جس کا بچہ ہے وہ تمہیں پسند نہیں

ہے تو تم شادی کرو گی تو کس سے کرو گی؟ تمہارا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔"

"خوبصورت لڑکیوں کے مسئلے بہت جلد حل ہو جاتے ہیں مسٹر!"

وہ ہنسی اور اس کے خوبصورت دانت چند لمحوں کے لیے اُس کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نازک لبوں میں چمک چمک گئے۔ وہ یقیناً خوبصورت تھی مگر اس کی خوبصورتی نرم گرم اور گداز چیزوں کی یاد نہیں دلاتی تھی۔ اس کی خوبصورتی دیکھ کر سخت اور چمکیلی چیزوں کا خیال آتا تھا۔ جیسے بلور، سونا، موتی، خوبصورت لیکن سخت!

اس نے میرا بازو تھپک کر کہا۔

"میرے لئے چنتا نہ کرو۔ مجھے ضرور میرے مطلب کا شوہر مل جائے گا۔ ایسا جو میرے غریب عاشق کی طرح خوب صورت ہو۔ میرے دوست بزنس مین کی طرح مالدار ہو۔ اور میری پسند کا بھی ہو۔"

اس نے گاڑی کا پٹ کھولتے ہوئے کہا۔

"اب تم اپنا مال سنبھالو اور گاڑی سے نیچے اتر جاؤ۔ جلدی کرو۔"

میں جم کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"اگر ایسا ہے تو تم اس گاڑی سے نیچے اتر جاؤ!"

"میں کیوں اتر جاؤں؟"

وہ حیران ہو کر بولی۔

"اس لئے کہ تم اگر اپنی پسند کی خاطر اپنے بچّے کو قربان کر سکتی ہو تو اسی پسند کے لئے تمہیں اس گاڑی سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ کیونکہ یہ گاڑی

مجھے پسند ہے۔ یہ گاڑی مجھے لکھ دو، ورنہ چلو تھانے۔"

"مسٹر!" وہ لڑکی ایک دم چیخ کر بولی اور اس نے زور سے میری کلائی پکڑ لی اُس نے اپنے لمبے لمبے ناخن زور سے میری کلائی میں گاڑ دیئے اور کہا۔

"مسٹر میں تمہیں سب کچھ دے سکتی ہوں۔ مگر یہ گاڑی نہیں دے سکتی۔ اسی گاڑی کے لیے تو میں نے یہ بچہ پیدا کیا ہے۔ میری سب سہیلیوں کے پاس گاڑیاں ہیں۔"

سب ہی اپنی اپنی گاڑیوں پر اِٹھلا کر چڑھتی تھیں اور بات بات میں اپنی گاڑی کا رُعب جتلاتی تھیں۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ ان میں سے دو نے اپنی گاڑیاں بالکل اسی طرح حاصل کی تھیں۔ جس طرح میں نے یہ گاڑی حاصل کی ہے۔

سو ہاؤ کُڈ آئی آل رائیٹ اِٹ

(SO HOW COULD I ALL RIGHT IT

میں نے بھی اس بزنس مین سے دوستی کر لی۔ جو دو سال سے میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔

اس گڈی کے لیے تو میں نے یہ بچہ پیدا کیا ہے اور تم چاہتے ہو کہ میں یہ گاڑی تمہیں دے دوں؟ آر یو نٹس؟ (ARE YOU NOTS"

وہ لڑکی مجھ سے بہت خفا تھی، اس کا صبیح چہرہ ایک دم سُرخ ہو گیا تھا۔ اور وہ میری طرف ایسی شدید نفرت سے دیکھ رہی تھی جیسے میں نے اس سے اس کی کار نہیں،

اُس کی عصمت طلب کی ہو۔ وہ بار بار اپنا نچلا ہونٹ چبا رہی تھی۔

میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔

تھوڑی دیر بعد اس کا غصہ سرد ہو گیا۔ تو اس نے اپنے ناخن میری زخمی کلائی سے باہر نکال لئے۔ اپنی پلکیں اپنے رخساروں پر گرالیں اور بڑی کمزور آواز میں بولی۔

"یہ گاڑی تو میں نہیں دے سکتی۔ اور جو تم چاہو......"

"اب تو میں صرف یہ چاہتا ہوں"

میں نے جھنجلا کر اس سے کہا۔

کہ کوئی ایسی ترکیب ہو جائے جس سے تمہاری ایسی مائیں بچے نہ جنا کریں۔ بے بی آسٹن جنا کریں، ریڈیو جنا کریں۔ ریفریجریٹر جنا کریں، لیکن بچے نہ جنا کریں۔ اگر ایسا ہو جائے تو اس دنیا سے حرامی بچوں کی پیدائش کا مسئلہ کسی حد تک حل ہو جائے گا!"

یہ کہہ کر میں نیچے اُترا، اور اس کی گاڑی کا پٹ زور سے بند کر دیا۔ اور جلدی جلدی وہاں سے چلا گیا۔

شام تک کوئی نہ آیا۔ پالنا خالی ہی رہا۔ رات کا اندھیرا بڑھتا گیا۔ دل کا سناٹا گہرا ہوتا گیا۔

گلی کے سیاہ اور پھٹے ہوئے ہونٹوں میں بجلی کے دو چار میلے اور پیلے قمقمے مسکرانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ جب نو کے قریب مجھے زور کی بھوک لگی۔ تو میں نے واپس گھر چلنے کی ٹھانی۔

اتنے میں میں نے دیکھا ایک میلے کچیلے لبادے میں لپٹی ہوئی ایک منحنی سی عورت اس پالنے کے سامنے رُکی۔ دیر تک رُکی رہی۔ پھر اس نے جھک کر اپنے لبادے سے کچھ نکالا۔ اور اس پالنے میں رکھ دیا اور پھر دیر تک وہاں کھڑی رہی۔ پھر

دھیرے دھیرے واپس ہونے لگی سر جھکائے ہوئے ۔ میں اس کے تعاقب میں اُٹھ کر چلنے ہی والا تھا کہ تاریک سایوں میں وہ عورت پلٹتی ہوئی دکھائی دی ۔ واپس آ کر اس نے اپنے بچّے کو اٹھایا ۔ اپنے گلے سے لگایا اور واپس چل دی ۔ مگر گلی کے موڑ پر پہنچ کر وہ پلٹی ۔ اس نے واپس آکر اپنے بچّے کو پھر پالنے میں رکھ دیا اور گلی سے باہر بھاگ گئی ۔

سنگھ برادرز کے موٹر مرمت کرنے والے گیراج کے عقب سے جو راستہ لال قلعہ کو جاتا ہے ، اُدھر جاتے ہوئے میں نے پیچھے سے اس کا لبادہ کھینچ لیا ۔ یکایک میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی ۔

جب میں نے دیکھا کہ جسے میں نے عورت سمجھا تھا وہ ایک ادھیڑ عمر کا مرد ہے ۔ اس کے چہرے پر کئی دن کی بڑھی ہوئی داڑھی تھی اور اس کی آنکھیں زرد زرد کر سُوجی ہوئی تھیں ۔ میں نے اس سے درشت لہجے میں پوچھا ۔

"تم کس کا بچہ اُس پالنے میں چھوڑ آئے ہو؟"

چند لمحوں تک وہ میری طرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا رہا ۔ پھر وہ میرے پاؤں پر گر گیا اور گڑگڑا کر کہنے لگا ۔

"مجھے معاف کر دو ۔ حوالدار صاحب !"

اس نے مجھے سی ، آئی ، ڈی کا کوئی آفیسر سمجھا ہوگا وہ گڑگڑا کر معافی مانگ رہا تھا ۔

میں نے بھی اُس کی غلط فہمی کو دور کرنا مناسب نہ سمجھا ۔

"کس کا بچّہ ہے وہ ؟"

میں نے اس سے پھر سختی سے پوچھا۔

"جلدی بتاؤ؟"

"میرا بچہ ہے!"

"کیا حرام کا بچہ ہے؟"

"نہیں مائی باپ! میری بیوی کا بچہ ہے!"

"تیری بیوی کا بچہ ہے تو پھر تو اُسے اس پالنے میں کیوں رکھ آیا؟ تیری بیوی کیسی ماں ہے؟

اُس نے تجھے اس بات کی اجازت دے دی؟"

"میری بیوی مرچکی ہے حضور! دس دن ہوئے وہ ایک ماہ کا بچہ چھوڑ کر مرگئی۔"

گھر میں جو تھا اس کے کفن دفن پر لگ گیا۔ میں چھ ماہ سے بے کار ہوں۔ کہیں کوئی کام نہیں ملتا۔ گھر میں پانچ بچے ہیں۔

یہ چھٹا ایک مہینے کی ننھی سی جان کل سے بھوک سے بلک رہا تھا۔ تین دن سے گھر کے سب لوگ فاقے سے ہیں۔ مگر کسی نہ کسی طرح اس کے لیے دودھ ہم لاتے رہے۔ کل رات سے اس کے لیے دو گھونٹ دودھ بھی نہیں ملا۔ کیسی دنیا ہے یہ مالک؟

یہاں ننھے بچے کے لیے دودھ بھی نہیں ہے۔ تین دن سے میرے سب بچے میرے ساتھ فاقے کر رہے ہیں۔ وہ مرجائیں گے۔ میں جانتا ہوں وہ مرجائیں گے۔ میں بھی مرجاؤں گا۔

میں نے سوچا یتیم خانے کے لوگ اس کی پرورش کر سکیں گے ، اس لئے ننھی سی جان کو وہاں ڈال آیا ہوں۔

"تمہیں معلوم ہے وہاں وہ کیسے رہے گا۔ باپ ہوتے ہوئے بھی ساری زندگی بے باپ کا بیٹا کہلائے گا۔"

"مگر زندہ تو رہے گا جو اد ارجی زندہ تو رہے گا۔" اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

آدھی رات ۔

پالنا خالی ہے۔

انسان کے دل کی طرح !

انسان کی بھوک کی طرح !!

میں بہت تھک گیا ہوں اور میں نے جو کچھ آج دیکھا ہے ، وہ دیکھ کر واپس گھر بھی نہیں جانا چاہتا۔ میں تھک کر اور گر کر اسی پالنے میں سو جانا چاہتا ہوں۔

مگر یہ پالنا بہت چھوٹا ہے —— اور ہمارے گناہ بہت بڑے ہیں۔!

پھول کی تنہائی

"تمہیں کس طرح کا مکان چاہیئے؟"

کرائے کے مکانوں کے دلال نے مجھ سے پوچھا۔ وہ مجھ سے تم کہہ کر کبھی مخاطب نہ ہوتا۔ لیکن اس نے میری بوسیدہ پتلون پر نظر ڈال لی تھی۔

"مجھے ایسا مکان چاہیئے جس میں کمرہ تو چاہے ایک ہو۔ لیکن اس کے ساتھ غسلخانہ ہو۔ سامنے لان ہو۔ لان میں ہری گھاس ہو اور گھاس کے کنارے پھول ہوں۔"

"پھولوں کے درمیان دھوپ کھانے والی چھتری ہو۔ چھتری کے نیچے ایک حسینہ بیٹھی ہو؟"

دلال نے تصویر مکمل کی۔

"مسٹر! تمہیں مکان تلاش کرنے کی بجائے اپنی عقل کا بیمہ کرانا چاہیئے۔"

آدمی سمجھ دار معلوم ہوتا ہے۔ میں نے مکانوں کے دلال کی طرف تعریفی نگاہوں سے دیکھ کر سوچا۔

دلال نے میرے قریب آکر بہت آہستہ سے پوچھا۔

"کرایہ کیا دوگے؟"

"پچیس روپے۔"

"پچیس روپے؟" دلال زور سے چیخا۔

"پچیس روپے میں صرف گھاس آسکتی ہے! مکان نہیں.....،"

میں نے کہا۔

"میں نے تمہیں مکان دکھانے کے لیے تین روپے ادا کر دیئے ہیں۔ یہ بات تمہیں رقم وصول کرنے سے پہلے کہنی چاہیئے تھی۔ اب سیدھے سیدھے مکان دکھاؤ۔"

دلال تین روپوں کی رسّی سے بندھا بندھا ایک اڑیل ٹٹو کی طرح چلنے لگا۔ میں نے سوچا۔

ہر شخص کے گلے میں ایک رسی ہوتی ہے۔ تین روپے والی یا تین سو والی۔ یا تین ہزار والی یا تین لاکھ والی۔ لیکن رسی ہر ایک کے گلے میں ہوتی ہے یوں تو مجھے بھی اپنے گلے کے لیے رسی کی تلاش تھی۔ لیکن روپے والی نہیں، پھانسی والی! میں نے مرجانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

چلتے چلتے میرے دل نے مجھ سے پوچھا۔

"جب تم مرجانے کا فیصلہ ہی کر چکے ہو تو مکان کی تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔؟"

میں نے اپنے دل سے کہا۔

"تم بیچ میں مت بولو۔ تمہاری وجہ سے میں اس حالت کو پہنچ گیا ہوں۔ تمہاری

وجہ سے میں نے غلط عورت سے محبت کی۔ اپنے لیے غلط پیشہ اختیار کیا۔ اپنے دوست غلط چُنے۔ ساری عمر غلط دھڑے پر چلا۔ اب تم میرے اور میری موت کے درمیان بولنے والے کون ہوتے ہو۔۔۔؟"

"میں بولتا کہاں ہوں؟"

دل نے کہا۔

انتہائی انکساری سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر جب مرنا ٹھہرا تو مکان تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیوں نہ ایک پیڑ تلاش کر لیا جائے۔

ایک دریا۔ جھیل یا ریل گاڑی کا گھومتا ہوا پہیہ یا کوئی تیز سا چٹکی بھر زہر۔۔۔!"

"تم بڑے احمق ہو!"

میں نے دل سے کہا۔

آج تک تم مجھے نہ سمجھ سکے مجھ جیسا انسان ایک عامیانہ اور سستی قسم کی موت کیسے مر سکتا ہے۔ میں ایک بہار افروز موت چاہتا ہوں۔

ایک خوبصورت کمرہ۔ لیمپ شیڈ کی مدھم مدھم سنہری روشنی میں میرے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا آخری جام۔ چھت کے پنکھے کے ہُک سے لٹکتی ریشمی ڈوری میں میرا جھومتا ہوا جسم اور کھڑکی سے باہر ایک خوبصورت لان۔

لان میں ہری ہری گھاس۔ گھاس کے کنارے پھول۔ دھوپ کھانے والی چھتری کے نیچے بیٹھی ہوئی حسینہ۔ چاہے وہ ہمسائے کی بیوی ہی کیوں نہ ہو۔"

"رات کو دھوپ کہاں سے آئے گی اور وہ حسینہ رات کے وقت کھلی چھتری میں کیوں کر تمہارے لئے ٹھہرے گی؟"

دل نے پوچھا۔

" تو میں دن میں خودکشی کروں گا "

میں نے دل سے کہا۔

" مگر تم اب شٹ اپ ہو جاؤ "

دل چُپ ہو گیا۔

سامنے ایک مکان بھی آ گیا۔

عمدہ مکان تھا۔ ایک لہریے دار سیڑھی پر چڑھ کر پہلی منزل پر ایک خوبصورت سا کمرہ تھا۔ ہر دیوار کا رنگ الگ تھا۔ گرے۔ گولڈ، نارنجی، قرمزی، دیوار گیر وارڈ روب نیلے پتھر والا آتش دان، ایک ملحقہ کمرہ اور بھی تھا۔

دیواریں زرد، گلابی، بنفشی اور بادامی رنگ کی۔ اس کمرے کے ایک طرف بار بنی ہوئی تھی۔ اس سے ملحق ایک اور کمرہ تھا۔ اس میں دو وارڈ روب تھے۔ ایک میرے لئے اور ایک میری بیوی کے لئے۔ دو دیوار گیر آئینے تھے۔

پہلے دو سال عشق کرنے کے لیے اور اس کے بعد ساری زندگی منہ چڑانے کے لیے میں فرش پر اُلٹے سلیپر، گندے پیٹی کوٹ اور بچے کی .... کا تصور کرنے لگا۔

یہ تصور اس قدر خوش آئند تھا کہ میں جلدی سے دروازہ کھول کر ملحقہ غسلخانے میں داخل ہو گیا۔

غسل خانہ بہت بڑا صاف ستھرا تھا۔ فرش پر سفید ٹائیلس، دیواروں پر ہلکے نیلے رنگ کی ٹائیلیں۔ ہرے رنگ کی واش بیسن اور اسی رنگ کا باتھ ٹب۔ سامنے کھڑکی

سے نچلی منزل کا برآمدہ اور برآمدے سے باہر کا لان نظر آتا تھا۔ جس پر ہری ہری گھاس کے کنارے پھول کھلے ہوئے تھے۔ ان کے قریب سات رنگوں والی دھوپ چھتری کے نیچے ایک سترہ اٹھارہ برس کی حسینہ دنیا کا عظیم ترین ادب یعنی ایک جاسوسی ناول پڑھ رہی تھی۔

میں نے خوش ہو کر کہا۔

"آہا۔ خودکشی کرنے کے لیے کس قدر عمدہ جگہ ہے"۔

پھر میں نے فوراً مڑ کر دلال سے پوچھا۔

"اس کا کرایہ کتنا ہوگا؟"

"چار سو روپے"۔

"احمق!"

میں نے برافروختہ ہو کر کہا۔

"میں نے تم سے پچیس روپے والا مکان دکھانے کو کہا تھا!"

دلال مجھ سے کچھ کہے بغیر سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔

دوسرا مکان جو دلال نے مجھے دکھایا وہ بھی اچھا خاصا تھا پہلے مکان کا سا ساز و سامان اس میں نہ تھا۔ نہ وہ ناز و ادا کی کیفیت، نہ دیواروں کا وہ رنگ و روپ مگر عمدہ اور صاف ستھرا ضرور تھا۔

کمرے صرف دو تھے مگر دونوں ایک ہی غسل خانے میں کھلتے تھے۔ ایک طرف کچن تھا۔ کچن سے باہر برآمدہ اور برآمدے کے نیچے ایک خوشنما صحن میں ہری ہری گھاس اُگی ہوئی تھی۔

"اس میں پھول کہاں ہیں؟"

میں نے دلال سے پوچھا۔

"پھول تم خود اُگا سکتے ہو۔" وہ بولا۔

"دھوپ والی چھتری خرید سکتے ہو چھتری کے نیچے تم کسی حسینہ کی بجائے اپنی بیوی کو بٹھا سکتے ہو۔"

"پھول اُگانے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"دھوپ والی چھتری کے لیے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اور بیوی؟ میاں اگر میرے پاس بیوی ہوتی تو میں مکان ڈھونڈتا؟"

ایک کچن نہ ڈھونڈتا؟ اچھا خیر! جس کام کے لیے مجھے یہ مکان چاہیئے اُس کے لئے یہ بھی ٹھیک رہے گا۔ میں پھولوں کا ایک گملا رکھ دوں گا۔

"گملے کے اُوپر دھوپ والی چھتری کے بجائے اپنی کالی، بوسیدہ سیاہ برساتی چھتری رکھ دوں گا۔ اور اس کے اندر ایک حسینہ کا تصوّر بھی کر لوں گا۔ مگر اس کا کرایہ کیا ہوگا۔؟"

ڈھائی سو روپے۔؟

"احمق ڈھائی سو والا مکان کیوں دکھاتے ہو۔ مجھے صرف پچیس روپے والا مکان چاہیئے۔"

دلال نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ چپکے سے مکان کے باہر ہو گیا۔

تیسرا مکان جو میں نے دیکھا۔ سب سے پہلے غسل خانہ آتا تھا۔ پھر سیڑھیاں چڑھ کر ایک کمرہ آتا تھا۔

کمرے سے ملحق ایک کچن بھی تھا۔ حالانکہ غسل خانہ ہونا چاہیئے تھا۔
جب میں نے دلال سے پوچھا تو اس نے کہا۔
"اس علاقے میں جتنے مکان بنے ہوئے ہیں ان میں رہنے والے کمرے کے ساتھ ہی کچن رکھا گیا ہے! اور غسل خانہ سیڑھیوں میں!"
"یہ کیوں؟"
"یہ اس لئے کہ عورت کچن میں رہ کر ہر وقت اپنے شوہر پر نظر رکھ سکتی ہے دیکھو اس کچن کے ساتھ والا کمرہ نیچے جانے والی سیڑھی اور سیڑھی کے سامنے کا غسل خانہ تک نظر آتا ہے۔"
میں نے کہا۔
"خیریت گزری، میں نے کبھی کوئی بیوی نہیں پالی۔ اسلئے میں کسی کی نگہبانی سے نہیں ڈرتا۔"
رہا غسلخانے کے دور ہونے کا سوال۔ تو میرا کیا ہے۔ میں غسل خانے کو کچن اور کچن کو غسل خانے کی طرح استعمال کر لوں گا۔ مجھے تو دونوں ایک ہی طرح کے بنے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔
دلال نے میری فراست کی داد دیتے ہوئے کہا۔
"وہ آپ جانیں اور مالک جانے۔ اگر یہ مکان آپ کو پسند ہے تو نکالئے سو روپے!"
"سو روپے!"
میں نے بھینچ کر کہا۔

"کیسے سو روپے؟"

"سو روپے اس کا ماہانہ کرایہ ہوگا۔"

"ارے بھائی!"

میں نے ہاتھ جوڑ کر دلال سے کہا۔

"میں نے صرف پچیس روپے والا مکان دکھانے کو کہا ہے اور تم ہو کہ سینکڑوں کی بات کرتے نہیں تھکتے۔"

دلال نے کہا۔

"میرا کام تو آپ کو مکان دکھانا ہے۔ کیا معلوم آپ کو کون سا مکان پسند آ جائے۔ یہاں میں نے اکثر لوگوں کو دیکھا ہے کہ پچیس روپے والا مکان ڈھونڈنے آتے ہیں اور چار سو والا مکان لے لیتے ہیں۔"

ایسے بھی دیکھے ہیں کہ چار سو روپے والا مکان لینے نکلتے ہیں اور پچیس روپے والے مکان پر قانع ہو جاتے ہیں۔ گاہک کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

اب دلال جس بلڈنگ کے اندر مجھے لے گیا۔ وہ پانچ منزل والی اور جہاز نما تھی۔ اور اس کی چھت سے کنکریٹ کے چھجے پر ایک دخانی جہاز کی تصویر بنی ہوئی تھی اور اس پر لکھا تھا۔ S.S. ATMARAM MULTANI

دلال نے کہا۔

"اس بلڈنگ کے اندر گوشت کھانا منع ہے۔ پیاز کھانا منع ہے۔ شراب پینا منع ہے!"

"تو یہاں بیوی کے ساتھ رہنا بھی منع ہوگا؟"

میں نے پوچھا۔

دلال حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔

" پھر یہاں سوچنا بھی منع ہو گا۔ آسمان کی طرف تکنا بھی منع ہے۔ زور سے قہقہہ لگانا بھی منع ہو گا۔ بستر پر اوندھے لیٹ کر سگریٹ پینا بھی منع ہو گا۔ کندھے پر تولیہ ڈال کر اور دروازے پر کھڑے ہو کر سیڑھیوں سے اترتی ہوئی کسی شوخ حسینہ کو دیکھنا بھی منع ہو گا۔ مسٹر میں مکان دیکھنے آیا ہوں۔ ونوبا بھاوے کے آشرم میں داخلہ لینے نہیں آیا۔!"

یہ کہہ کر میں مکان سے باہر ہو گیا۔

دلال شرم سے سر جھکائے میرے پیچھے آ گیا۔

اب دلال مجھے جس مکان میں لے گیا وہ واقعی پچیس روپے والا مکان معلوم ہوتا تھا۔ نہ لان۔ نہ گھاس، نہ پھول۔ چوتھی منزل پر ایک کمرہ تھا۔ کھڑکیوں پر لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھی۔ تاکہ مالک مکان کے تقاضوں سے گھبرا کر کرایہ دار کھڑکی سے کود نہ سکے۔

دیواروں پر بتیس برس کی پرانی سفیدی تھی جو اب سیاہی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ چھت کے سیاہ جالوں کے درمیان ایک بجلی کا پرانا پنکھا لٹک رہا تھا۔

میں نے بھی اپنے تصور میں منظور کر لیا تھا۔ کہ چلو لان نہ سہی، گھاس نہ سہی، پھول نہ سہی، حسینہ نہ سہی۔ اس کمرے میں پنکھے کا ہک تو ہے۔ جس سے لٹک کر جان تو دی جا سکتی ہے۔

"مگر غسل خانہ کہاں ہے؟"

"وہ سامنے ہے۔"

دلال نے ایک کونے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

میں جلدی سے غسل خانے میں جا گھسا۔ غسل خانہ میں بڑی بڑی آنکھوں والی ایک لحیم شحیم عورت ذبح شدہ مرغی کے پر نوچ رہی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی وہ غنچہ دہن ہنس دی اور جب اس کا موٹے موٹے ہونٹ والا اٹھارہ انچ لمبا غنچہ پوری طرح کھلا تو مجھے اس کے اندر پان کی پیک میں رنگے ہوئے دانت بہت خطرناک دکھائی دیئے۔ میں گھبرا کر پیچھے کو لوٹنے ہی والا تھا کہ اس کافرادا نے اپنے پہاڑ جیسے کولھے مٹکا کر کہا۔

"تم نئے کرایہ دار معلوم ہوتے ہو؟"

"معلوم ہوتا ہوں کہ نہیں البتہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، یہ غسل خانہ کس کا ہے، آپ کا یا میرا؟"

"تمہارا بھی اور میرا بھی۔"

اس نے کچھ ایسے انداز سے کہا جیسے زندگی بھر کا میرا اور اس کا رشتہ پکا ہو گیا ہو۔ میں نے گھبرا کر ایک قدم اور پیچھے ہٹایا۔ اُس نے فوراً ایک قدم آگے بڑھا کر کہا۔

"تم آجاؤ۔ فکر نہ کرو۔ مل جل کر گزارہ کر لیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ میں گھبرا کر دروازے میں پہنچ گیا۔

اُس نے مُرغی کا آخری پر زور سے نوچ کر اپنے غنچے میں لے لیا اور اس سے دانت صاف کرتے ہوئے بولی۔

"اب پچاس روپے میں مالک مکان کمرے کے ساتھ الگ غسل خانہ دینے سے تو رہا۔"

میں نے بلڈنگ سے باہر آکر دلال سے کہا۔

"اگر تم مجھے پچیس روپے والا مکان نہیں دکھا سکتے تو میرے تین روپے واپس کر دو۔"

دلال نے کہا۔

"شریفوں کے علاقے میں تو پچیس روپے والا مکان نہیں مل سکتا۔ ہاں اگر آپ کو گندی بستی میں رہنے پر اعتراض نہ ہو تو میں آپ کو پچیس روپے والا مکان دلا سکتا ہوں۔"

"چلو چلو، مکان دکھاؤ باتیں نہ بناؤ۔"

وہ مجھے گندی بستی میں لے گیا۔ جو شہر کا سب سے گندا علاقہ تھا۔ جہاں شہر کے نہایت غریب لوگ رہتے تھے۔ جہاں تنگ گلیاں تھیں۔ غلاظت کے انبار تھے۔ کھلی موریاں تھیں۔

نکڑ پر اس نے گندی بستی کے دلال کو الگ لے جا کر کچھ باتیں کیں۔ پھر وہ دونوں میرے پاس واپس آئے اور میرے دلال نے مجھ سے کہا۔

"یہ کہتا ہے کہ اس بستی میں پچیس روپے والا مکان نہیں ہے۔"

"تو پھر کس کرائے کا مکان ہے؟"

"سولہ روپے والا مکان ہے؟"

"تو سولہ روپے والا ہی مکان دکھاؤ۔"

"سولہ روپے والا۔ مکان بھی خالی نہیں ہے۔ البتہ ایک ہے۔ لیکن وہ تمہارے لائق نہیں۔"

"میرے لائق کیوں نہیں؟"

میں نے گندی بستی کے دلال کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

گندی بستی کے دلال نے اپنی ٹھوڑی کھجا کر کہا۔

"صاب! اُس کھولی کا کرائے دار کل مر گیا۔"

"تو بہت اچھا ہے کھولی خالی تو ہوگئی۔"

"ہاں خالی ہوگئی صاب! گندی بستی کا دلال اپنی کہنی کھجا کر بولا۔"

مگر وہ کرائے دار اپنی طرح ہی ایک گریب مجدور (مزدور) تھا اور چوڑیوں کے کھار کھانے (کارخانے) میں کام کرتا تھا!

"مزدور تھا تو کیا ہوا۔ آخر وہ چوڑیاں بناتا تھا چوریاں تو نہیں کرتا تھا؟"

"نہیں صاب! یہ بات نہیں ہے۔ گندی بستی کا دلال اپنی کمر کھجاتے ہوئے بولا۔

"تو چوڑیاں بنانے والا مگر دھونکنی دھونکتے دھونکتے اور جلتی ہوئی ریت پھانکتے پھانکتے وہ بیمار ہوگیا۔"

"تو اس میں کیا ہے۔ ہر ایک شخص اپنی زندگی میں بیمار ہوتا ہے اور کسی نہ کسی وجہ سے بیمار ہوتا ہے۔ چاہے وہ ریت پھانکنے سے بیمار ہو یا زیادہ کھانے سے بیمار ہو!"

"تم سمجھتے نہیں ہو صاب!"

گندی بستی کا دلال اپنی ران کھجاتے ہوئے بولا۔

"بات اصل میں یہ ہے کہ اس کو بخار ہو گیا تھا۔ جس کو تم تپ دق بولتے ہو۔
اور وہ اس کھولی میں پانچ سال بیمار رہا اور کام کرتا رہا اور اپنے جینے کے لیے
لڑتا رہا۔ کیوں کہ اس کے چار بچے تھے اور ایک بیوی تھی۔ جب وہ مرگیا تو اس کی
بیوی اور بچے یہ کھولی خالی کر گئے۔"

کیونکہ وہ سولہ روپے کرایہ نہیں دے سکتے تھے۔ وہ شہر کے باہر جھونپڑیوں میں
چلے گئے۔ جہاں اینٹ ڈھونے والے رہتے ہیں۔ اس لئے میں تم کو بولتا ہوں کہ
یہ کھولی خالی تو ہے، پر تمہارے لائق نہیں ہے۔"

چھوٹی سی کھولی تھی تاریک دیواریں۔ چرچراتا ہوا دروازہ۔ زنگ آلود کنڈی۔ کھڑکی
کی زنگ آلود سلاخیں اور آہنی سلاخوں کے باہر گندی اینٹوں والی موری میں نے
باہر سے نظر ہٹا کر پھر اندر دیکھا۔ تو ایک کونے میں پانی کا نل نظر آیا۔
جس کے منہ پر میلی دھجیاں ٹھونسی گئی تھیں۔ پھر بھی اُن دھجیوں کے آخری
سرے سے پانی سبزی مائل فرش پر تڑپ تڑپ کر کے بہہ رہا تھا۔ جیسے خون زخم سے
بہتا ہو۔

پھر مجھے ایک کونے میں مٹی کا گملا نظر آیا۔ جس میں گلاب کی شاخ پر صرف
ایک پھول تھا۔ گلاب کا بہت بڑا سُرخ پھول.....

"یہ کیا ہے؟"

گندی بستی کا دلال اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر ہنستا ہوا بولا۔

"یہ تمہارے لئے ہے صاب۔"

"میرے لئے؟"

میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں صاب!"

دلال نے کہا۔

"مرتے سمے مرنے والے نے کہا تھا۔ جو کوئی میری جگہ اس کمرے میں آئے اُسے یہ گملا دے دینا اور اُسے بولنا کہ ہر روز (روز) اس کی مٹی میں پانی دے۔ جس سے یہ گلاب کا پودا ہرا رہے۔ پگلا تھا وہ!"

یکایک میرے سارے بدن میں جھرجھری سی دوڑی اور مجھے کانپتا ہوا چھوڑ گئی۔

میں ان تاریک دیواروں میں گھرے ہوئے اُسی گلاب کے پھول کو دیکھنے لگا۔ چاروں طرف گھٹن اور سیلن اور نا اُمیدی اور یہ پھول۔ اکیلا........

اندھیرے میں اور گندگی میں اور بھوک میں اور بدصورتی میں یہ پھول........ ننگی اینٹوں والے طاقچے میں۔ مکڑی کے لٹکتے ہوئے غلیظ جالوں میں، زنگ آلود آہنی سلاخوں کے درمیان یہ پھول اکیلا..... انسان کے دل میں اُگتا ہوا اور انسان کے حوصلے اور بہادری اور عظمت کی طرح سر بلند۔ فطرت سے لڑتا ہوا۔ موت پر ہنستا ہوا..... لیکن یہ پھول مرجائے گا۔

ایک دن یہ پھول مُرجھا جائے گا۔ میں نے سوچا۔

اِس کھولی کی غلیظ گھٹن اِس کی ساری شادابی چوس لے گی۔ یہ تاریکی اِس کا رنگ و رُوپ چھین لے گی۔

اس پر مکڑی کے جالے پھیل جائیں گے اور یہ میلی ہوئی دیواریں چاروں طرف

سے تازہ ہوا رک کے رہ گئی۔ اور یہ پھول مرجھا جائے گا۔ جیسے وہ چوڑی والا مزدور مرجھا گیا تھا۔

لیکن یہ پھول زندہ رہے گا!

اور ہر روز لاکھوں کروڑوں آدمیوں کے دلوں میں اُگے گا۔ جو چوڑی بناتے ہیں۔ دفتر جاتے ہیں۔ کرگھا چلاتے ہیں اور رائینٹ پرائینٹ اس طرح رکھتے ہیں۔ جس طرح محبت کرنے والا انسان بوسے پہ بوسہ رکھتا ہے۔

یہ پھول ہر روز اُن انسانوں کے دل میں اُگے گا اور زندگی اور اُس کی مسلسل جدوجہد کا جادو جگائے گا!

یہ پھول کبھی نہیں مرسکتا۔

میں نے وہی کھولی کرائے پر لے لی ہے —— اور اُس دن سے وہیں رہتا ہوں ——!!

ڈھکی کے نیچے

ڈھکی کے نیچے پولیس کی گڑھی تھی اور گڑھی کے نیچے تقریباً ایک میل لمبا میدانی علاقہ تھا۔ اُس علاقہ کے بچوں کے خیال کے مطابق اس سے لمبا میدان دنیا میں کہیں نہ ہوگا۔ اس میدان میں جو بازار تھا۔ اُس میں سو کے لگ بھگ دکانیں تھیں اور بازار کے پیچھے دونوں طرف علاقے کے نہایت غریب اور نہایت امیر لوگوں کے گھر تھے۔

دو منزلہ، سہ منزلہ گھر۔ پختہ گھر، پتھر کی دیواروں کے گھر۔ ٹین کی چھتوں کے گھر، گھروں کے درمیان گلیاں، گلیوں میں نکڑ اور ناکے، جہاں گندے لڑکے شور مچاتے ہوئے کبڈی یا قاضی کو لڑایا۔ شاہ چور ڈاکو کھیلتے تھے ڈھکی کے نیچے میدانی علاقے میں مقامی باشندوں کے گھر تھے۔

خاص خاص موقعوں کے سوا مقامی باشندوں اور گھر والوں کو اس طرف آنے کی ممانعت تھی۔

اگرچہ کوئی تحریری ممانعت نہ تھی ۔ مگر ایک غیر تحریری معاہدہ ضرور تھا۔ جس کی پابندی دونوں دنیاؤں میں ہوتی تھی ۔ ہماری دنیا الگ تھی ۔ اُن کی دُنیا الگ تھی ۔ دونوں کے درمیان ایک اُوپری قسم کی مفاہمت تھی ۔ اس کی سطح کے نیچے مخاصمت کی ایک تیز رو بھی چلتی تھی ۔ جس کی وجہ سے نہ آفیسر لوگ مقامی باشندوں پر اعتماد کر سکتے تھے ۔ اور نہ مقامی باشندوں کو آفیسروں پر پورا بھروسہ تھا۔

یوں بھی نشیب و فراز میں تضاد تو ہو سکتا ہے ، اعتماد کیسے ہو سکتا ہے ایک حکم دیتا ہے دوسرا اُس حکم کی تعمیل کرتا ہے ۔ اس رشتے میں محبت کیسے آ سکتی ہے ؟

ڈھکی کے اوپر رہنے والے ڈھکی سے نیچے رہنے والوں کو حقارت کی نگاہ سے اس لئے بھی دیکھتے تھے کہ نیچے والے علاقے میں دن رات مار پیٹ اور دھینگا مشتی ہوتی رہتی تھی ۔

ہر روز ایک دو کیس پولیس کے پاس آجاتے اور پھر زخمی چارپائیوں پر لدے ہوئے ہسپتال پہنچا دیئے جاتے ۔ مقامی باشندوں کی لڑائیوں سے آفیسر لوگ بہت تنگ تھے ۔ لیکن یہ درست تھا کہ انہیں لڑائیوں کے طفیل اُن کی حکومت چلتی تھی بلندی اور پستی کے درمیان فاصلہ قائم رکھنا کس قدر مشکل ہے ۔ اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خود بلندی پر رہتے ہوں ، لیکن یہ سچ ہے کہ ڈھکی .... کے نیچے رہنے والے لوگوں کے بغیر ڈھکی کے اوپر رہنے والوں کا گزارہ نہیں ہو سکتا تھا ۔ ہمارے ملازم وہیں سے آتے تھے ۔

دھوبی ، باورچی ، مالی ، خدمت گزار ، انڈے والے ، دُودھ ، ڈبل روٹی مکھن ، بسکٹ والے ، کپڑے بیچنے والے ، کپڑے دھونے والے ، نائی ، موچی ، سُنار ، لوہار ، لکڑہارے ، یہ تو سچ ہے کہ اگر ڈھکی کے نیچے رہنے والے لوگ نہ ہوں تو ہمارے گھر میں چُولھا تک نہ جلے ۔ لیکن یہ ایک ایسی خطرناک حقیقت تھی ۔ جسے سارے علاقے میں کوئی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا ۔

ہم سمجھتے تھے اور ہمیں سمجھایا جاتا تھا کہ دنیا بلندی پر قائم ہے ۔ بچپن میں مجھے ان تمام باتوں کا اتنا شدید ، صریح اور کھلا احساس نہ تھا ۔ بہت سی باتیں گڈمڈ تھیں ۔ جنہیں ڈھکی کے اوپر رہنے والے لوگ اپنی باتوں سے اور گڈمڈ کر دیتے تھے ۔

مجھے بار بار بتایا جاتا تھا کہ ڈھکی کے نیچے رہنے والے لوگوں سے زیادہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں ۔ اُن سے دور رہنا چاہیئے ۔

وہ لوگ چور اور بدمعاش ہیں ۔ فریبی اور بے ایمان ہیں ۔ لڑاکے اور نفرت کرنے والے ہیں ۔ وہ لوگ جینا نہیں جانتے ۔ تہذیب چھو کر نہیں گزری ۔

ایسے لوگوں سے ہمارا کیا تعلق ؟ ــــ ایک روز سارا ہسپتال زخمیوں سے بھر گیا دس بارہ چارپائیاں لدی ہوئی زخمیوں کو لئے پولیس والوں کی نگرانی میں پہنچیں اور یہ بھی سنا کہ دو چار اور آرہی ہیں ۔

ڈھکی کے نیچے رہنے والوں میں بڑی خطرناک لڑائی ہوئی تھی ۔ پندرہ بیس آدمی زخمی ہوئے تھے جن میں سے دو تو جانکنی کی حالت میں تھے ۔

پتاجی اُوپر ہسپتال سے نیچے میری ماں سے صرف یہ کہنے آئے تھے کہ آج کاکے کو اُوپر نہ بھیجنا ۔ سارا ہسپتال زخمیوں سے بھرا پڑا ہے ۔ ہوسکتا ہے اُن میں سے دو

تین مر جائیں اور بچے پر بہت بُرا اثر پڑے۔

میری ماں یہ سن کر رنگین کہانیوں والی ایک کتاب لے کر میرے پاس بیٹھ گئیں۔ اور مجھے دیووں اور پریوں کی کہانیاں سنانے لگیں۔ لیکن میرا دل چاہتا تھا کہ اوپر ہسپتال میں جاکر زخمیوں کو دیکھوں۔

لڑائی کیسے ہوئی؟ کیوں ہوئی؟ کیسے کیسے وہ جنگجو لوگ ہوں گے پندرہ بیس زخمی ساتھ میں پچاس ساٹھ دوسرے آدمی بھی آئے ہوں گے۔ اور ہسپتال میں گہما گہمی ہے اور میں یہاں کہانی سن رہا ہوں۔

راجہ کے بیٹے کو ایک پری نے جادو کے زور سے مینڈک بنا دیا۔ کس کمبخت کو مینڈکوں سے دلچسپی ہے۔ ماں جی کسی طرح میرے پاس سے ہٹیں تو میں اُوپر ہسپتال کی طرف دوڑوں لیکن جب پندرہ منٹ گزر گئے اور ماں جی نہ ہٹیں اور کہانی ہوتی گئی۔ تو یکایک میرے پیٹ میں درد شروع ہو گیا اور جب سوڈا منٹ کھانے پر بھی دور نہ ہوا تو ماں جی نے کرپارام کو بُلا کر کہا۔

"اوپر جاکر ڈاکٹر صاحب سے پیٹ کے درد کی دوا لے آ۔ کاکے کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے!"

"میں خود چلا جاتا ہوں —!"

میں نے نہایت نرمی سے مشورہ دیا۔

"نہیں —!"

ماں جی بہت سختی سے بولیں۔

میں نے کہا۔

"پیٹ میں درد بھی نہیں، ایک گولا سا بھی معلوم ہوتا ہے۔"

"گولا سا بھی۔؟"

ماں جی ذرا پریشان ہو کر بولیں۔

"اور گولے کے اندر ایک ڈھول سا بجتا ہے۔ گھوں گھوں گھوں۔"

"گولے کے اندر ڈھول؟"

ماں جی اور بھی گھبرا گئیں۔

"ہاں! اور ڈھول کے اندر ایک پھپھولا سا اٹھتا ہے۔ ایسا لگتا ہے پیٹ ابھی پھٹ جائے گا۔"

میں نے زور سے پیٹ پکڑتے ہوئے کہا۔

ماں جی بالکل گھبرا گئیں۔

"کرپے! تو جلدی سے کاکے کو ڈاکٹر صاحب کے پاس لے جا اور جا کے دکھا دے اور کہہ دینا کہ سب کام چھوڑ کر پہلے کاکے کے لیے دوا دے دیں۔"

"جی بہت اچھا!"

کہہ کر کرپا میرا ہاتھ پکڑ کر لے چلا۔ میرا ایک ہاتھ کرپا کے ہاتھ میں تھا۔ اور دوسرے ہاتھ سے میں اپنے پیٹ کو پکڑے ہوئے تھا۔ جب تک برآمدے کا کونہ نظر آتا رہا میں اسی طرح پیٹ کو پکڑ کر چلتا رہا۔ لیکن جونہی بنگلے کے پیچھے پہنچا، میں نے ایک جھٹکا دے کر کرپے سے ہاتھ چھڑا لیا اور سیدھا ہسپتال کا راستہ لیا اور جاتے کرپے سے کہہ دیا۔

"اگر ماں جی سے کچھ نہ کہے گا تو دوُنّی دوں گا۔"

کرپے کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ ایک تو وہ بے حد لالچی تھا۔ دوسرے میرے فرضی کام کے سلسلے میں اُسے بھی گھنٹہ پون گھنٹہ کی چھٹی مل رہی تھی۔

معاملہ بُرا نہیں تھا۔ اس لئے وہ اُسے قبول کیسے نہ کرتا۔

میں ڈرتا ہوا ہسپتال کے قریب پہنچ گیا۔ برآمدے میں تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ سارا برآمدہ زخمیوں کی چارپائیوں سے بھرا پڑا تھا۔ بلکہ کچھ چارپائیاں برآمدے کے باہر باغ کے قطعے میں پڑی تھیں۔ اور دوسرے قطعے میں قربان علی سارجنٹ، پورن مل شاہ اور دوسرے بے "فکروں کو لڑائی کے قصّے سنا رہا تھا۔

میں بھی مجمع میں شامل ہو کر ان کی باتیں سننے لگا۔

"ہاں تو بتا رہا ہوں۔ کہہ تو رہا ہوں۔ جھگڑا کوئی آج کا نہیں ہے۔ کل کا نہیں ہے۔ جھگڑا بہت پُرانا ہے۔"

یہ سمجھ لو کہ ایک طرف چوہدری خوشی رام کا مکان ہے۔ دوسری طرف سردار شہباز خان کا مکان ہے۔ بیچ میں یہ زمین ہے جس پر فریقین اپنا حق جتاتے ہیں۔"

"مگر دراصل زمین کس کی ہے؟"

کہر سنگھ سنار نے پوچھا۔

"اسی کا تو جھگڑا ہے کہہ تو رہا ہوں۔ بتا تو رہا ہوں۔ زمین ہی کا تو جھگڑا ہے تحصیلدار کچھ کہتا ہے۔ گرداور کچھ کہتا ہے۔ پٹواری کچھ کہتا ہے۔ جو زیادہ رشوت دے دے زمین اسکی ہو جاتی ہے۔

عارضی طور پر کبھی شہباز خاں کی ہو جاتی ہے۔ کبھی چودہری رام کی۔ مگر انتقال

کسی کے نام نہیں ہوا ابھی تک۔"

"انتقال کیوں نہیں ہوا ابھی تک۔؟"

" انتقال ہو جاتا تو زمین کا سارا جھگڑا ہی مٹ جاتا۔ کہہ تو رہا ہوں۔ بتا تو رہا ہوں"

قربان علی ایک دانش ور فلسفی کی طرح ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔

"ایک طرف سردار شہباز خاں۔ دوسری طرف چودھری خوشی رام، نمبردان لڑاکے اور لٹھ باز دونوں طرف امیر اور طاقت کے نشے میں پھولے ہوئے ایک کو مسلمانوں کی اکثریت کی حمایت حاصل، دوسرا حاکموں کی حمایت پر نازاں"

" وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ ملک عطا محمد کیسے بیچ میں آگیا!"

پورن مل شاہ نے پوچھا۔

" جھگڑا تو چودھری خوشی رام اور سردار شہباز خاں کا تھا۔ یہ ملک عطا محمد کیسے بیچ میں آگیا۔؟"

" کہہ تو رہا ہوں، بتا تو رہا ہوں"

قربان علی نے مزے سے سگریٹ کا کش لے کر کہا۔

" ایک رات پرمیشور کا نام لے کر چودھری خوشی رام نے متنازعہ زمین پر مکان بنانا شروع کر دیا۔ اور راتوں رات دیوار کھڑی کر دی۔ جسے دوسرے دن اللہ کا نام لے کر شہباز خان نے گرا دیا"

دوسری رات پھر چودھری خوشی رام نے گرا دیا۔ بارہ دن تک یہی قصہ چلتا رہا۔ آخر چودھری خوشی رام کے بڑے بیٹے حوالدار آتما رام کو غصہ آگیا۔

وہ ایک مہینے کی چھٹی پر گھر گیا ہوا تھا۔ وہ ایک گنڈاسا لے کر باہر نکل آیا اور

لگا۔ شہباز خاں کو مقابلے میں آنے کے لیے للکارنے۔

اُدھر شہباز خاں بھی سرداروں کا سردار ہے۔ ایک زمانے میں اُس کے بزرگوں نے اِس علاقے پر حکومت کی تھی۔ اُسے بھی طیش آگیا۔ وہ اپنے خاندان والوں کو لے کر لڑائی کے لیے باہر نکل آیا۔

اُدھر موہیال براہمن بھی تم جانتے ہو بڑے خونخوار ہوتے ہیں، اپنے آپ کو پرسرام کی اولاد کہتے ہیں اور انگریزی سرکار کی فوج میں بھرتی ہو کر بڑا نام پاتے ہیں۔ وہ سب لوگ مشورہ کر کے چودھری خوشی رام کی ٹولی میں شامل ہو گئے اور قریب تھا کہ ہندو مسلم فساد ہو جاتا لیکن عین وقت پر ملک عطا محمد بیچ میں کود پڑا۔

"ملک عطا محمد کو کیا پڑی تھی؟"

پورن مل شاہ نے پوچھا۔

"کہہ تو رہا ہوں، بتا تو رہا ہوں۔"

ملک عطا محمد اپنے دو بیٹوں جان محمد اور غلام محمد اور اپنے خاندان والوں کو لے کر بیچ میں آگیا۔ اُس نے چودھری خوشی رام کو پیچھے ہٹا دیا بولا۔

"چودھری صاحب تو بیچ میں مت بول۔ یہ لڑائی تو میری ہے!"

اتنا کہہ کر اس نے چودھری خوشی رام کو پیچھے ہٹا دیا اور شہباز خاں کو للکار کر کہنے لگا۔

"اس زمین پر تو چودھری خوشی رام کا مکان بنے گا۔ چوری چھپے نہیں دن دہاڑے بنے گا۔ اگر تجھ میں مقابلہ کرنے کی ہمت ہے تو تو مونچھ اونچی کر کے سامنے آجا۔"

"واس کے بعد لڑائی کیسے نہ ہوتی؟ یہ سنتے ہی شہباز خان نے ملک عطا محمد پر چھری کا وار کیا اور دونوں دھڑوں میں گھمسان کی لڑائی ہونے لگی۔"

"کشتوں کے پشتے لگ گئے۔"

"اور پولیس کہاں تھی۔؟"

فتو کمہار نے پوچھا۔

قربان علی سرجنٹ غضب ناک نگاہوں سے فتح دین کمہار کی طرف دیکھ کر غصے سے بولا۔

"کہہ تو رہا ہوں، بتا تو رہا ہوں۔ میں تو موضع لال گڑھی میں ایک مفرور مجرم کو پکڑنے کے لیے گیا ہوا تھا۔"

دو سپاہیوں کو ساتھ لے کر تھانے دار صاحب چک کلاں میں تفتیش کرنے گئے ہوئے تھے۔

حوالدار نیاز محمد کے پیٹ میں درد تھا اور چار سپاہی چھٹی پر تھے۔ میں نے آتے ہی معاملے کو ہاتھ میں لے لیا اور اب تو تھانے دار صاحب بھی تفتیش اُدھوری چھوڑ کر واپس آ پہنچے ہیں؟"

"یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ ملک عطا محمد کو کیا پڑی تھی.....؟"

"ملک عطا محمد تو ایسا زخمی ہوا ہے کہ اُس کے اور اس کے بیٹے جان محمد کے بچنے کی کوئی اُمید ہی نہیں ہے۔"

ابھی مجسٹریٹ لال خان بھی اندر گیا ہے اور تھانے دار صاحب بھی اندر ڈاکٹر صاحب کے پاس موجود ہیں۔ غالباً ملک عطا محمد کا بیان ہو رہا ہے اس کے بیان سے معلوم ہو گا

کہ اُسے کیا پڑی تھی جو اُس پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑا کر اپنی جان کی بازی لگائی ؟"
یہ کہہ کر سگریٹ کا لمبا کش لگاتا ہوا قربان علی مجھ کو وہیں برآمدے کے باہر چھوڑ کر برآمدے کا زینہ چڑھنے لگا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔
برآمدے میں بہت بھیڑ تھی لیکن لوگوں نے سارجنٹ کو دیکھ کر راستہ دے دیا۔ میں بھی قربان علی کے ساتھ ہسپتال کے اندر چلا گیا۔ حالانکہ دروازے پر پہرہ تھا۔
لیکن سب لوگ مجھے پہچانتے ہیں اس لئے کسی نے مجھے نہ ٹوکا۔
قربان علی آپریشن رُوم کے اندر چلا گیا۔ میں بھی اس کی آڑ لے کر اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اس لئے کسی نے مجھے نہیں دیکھا۔
قربان علی کی اُونچی لمبی ٹانگوں کے بیچ میں سے میں نے دیکھا کہ ایک چارپائی پر جانی محمد کی لاش پڑی ہے۔ سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی اور ایک چارپائی پر ملک عطا محمد سخت زخمی پڑا ہے اور مجسٹریٹ لال خاں اس کا بیان قلمبند کر رہا ہے۔
ایک کرسی پر ڈاکٹر صاحب بیٹھے تھے۔ ایک پر تھانے دار صاحب اُن کے پیچھے چودھری خوشی رام اپنی پگڑی سنبھالے کھڑا تھا۔
"ملک عطا محمد! تم نے دوسروں کی لڑائی میں کیوں دخل دیا۔ زمین کا جھگڑا تو شہبانہ خاں اور چودھری خوشی رام کے درمیان تھا۔ تم بیچ میں کیوں کود پڑے ؟"
مجسٹریٹ لال خان نے پوچھا۔
ملک عطا محمد ہولے ہولے بول رہا تھا۔ جیسے ایک ایک لفظ کو تول رہا ہو۔
" سرکار کو ۱۹۰۵ء کی پلیگ تو یاد نہ ہو گی۔ سرکار تو ابھی آئے نہ تھے۔ لیکن جو اُس زمانے کے لوگ یہاں موجود ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ہمارے علاقے میں ایسی سخت تباہی

کا زمانہ کبھی نہیں آیا"

ہر روز لوگ درجنوں اور کبھی کبھی سینکڑوں کی تعداد میں مرتے تھے۔ سرکاری بیل گاڑیاں آتی تھیں اور لاشوں کو لاد کر لے جاتی تھیں۔

لوگ علاقہ چھوڑ کر بھاگ رہے تھے نہ ماں کو بیٹے کی پرواتھی اور نہ بیٹے کو ماں کی۔ نفسا نفسی تھی۔

اُن دنوں میری عمر مشکل سے بیس سال کی ہوگی۔ گھر میں سب سے پہلے مجھے پلیگ کی گلٹی نکلی۔ اور مجھے پلیگ میں مبتلا دیکھتے ہی گھر والے چھوڑ کر بھاگنے لگے۔

میں بخار میں پُھنک رہا تھا۔ لیکن کسی نے میری بات نہ پوچھی۔ کوئی میرے نزدیک نہیں آیا۔ سب لوگ ہائے ہائے کر کے اپنی جان لے کر بھاگے۔

ماں بھی۔ بہن بھائی بھی۔ باپ بھی۔ پل بھر میں گھر خالی ہوگیا۔ میں بھی ان کے پیچھے یہ کہتا ہوا دوڑا۔

ارے ظالمو! کہاں جا رہے ہو؟

مجھے بھی ساتھ لے چلو۔

لیکن وہ سب لوگ مجھے دیکھ کر اس طرح بھاگے جیسے میں انسان نہیں۔ بھوت ہوں۔

میں بے ہوش ہو کر دروازے پہ گر پڑا۔

پھر مجھے یاد نہیں کیا ہوا؟ کب تک میں بے ہوش رہا۔

اس بے ہوشی کے عالم میں سرکاری بیل گاڑی آئی اور مجھے مُردہ سمجھ کر لیجانے لگی۔ گاڑی والوں نے مجھے مُردہ سمجھ کر گاڑی میں رکھ لیا تھا کہ اتنے میں چودھری خوشی رام کے والد

چودھری سیتارام مرحوم کہیں سے آ نکلے۔ انہوں نے میری ہلتی ہوئی ٹانگوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ مجھ میں ابھی جان باقی ہے۔

انہوں نے اُسی وقت بیل گاڑی سے مجھے اُتروا لیا۔ خود اپنے کندھے پر اٹھا کر اپنے گھر لے گئے۔ اور ان کی دن رات کی خدمت سے دوادارو سے میں اچھا ہوگیا۔ پھر پلیگ کی بیماری دور ہوگئی۔

میرے بال بچے ہوئے۔ مجھے عزت اور خوشی ملی۔

سرکار! میری زندگی چودھری سیتارام کی دی ہوئی تھی۔ وہ آج اس کے خاندان والوں کے کام آگئی۔ اس کی مجھے بڑی خوشی ہے۔

ملک عطا محمد اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔ اس کا چہرہ یکدم پیلا پڑ گیا اور اس کی سانس رُک رُک کر چلنے لگی اور بہت مشکل سے اس نے آنکھیں کھولیں اور چودھری خوشی رام کو اشارے سے اپنے پاس بُلایا اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر کہا۔

"چودھری خوشی رام! اُس وقت سے ایک جان کا قرضہ تمہارے خاندان کا ہمارے خاندان پر چلا آتا ہے۔"

آج میں نے وہ قرضہ اتار دیا ہے۔ بلکہ ایک جان کا اور قرضہ تمہارے اُوپر چڑھا دیا ہے۔ ٹھیک ہے؟"

"چودھری خوشی رام آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔"

"ہاں ٹھیک ہے!"

دیر تک خاموشی رہی۔

پھر آہستہ ملک کا ہاتھ چودھری کے ہاتھ سے الگ ہوکر اپنے سینے پر چلا گیا۔

اسکی آنکھیں بند ہوگئیں اور اُس کے رُکتے ہوئے گلے سے اتنا نکلا۔

"مجھے میرے بیٹے کی قبر کے پاس دفن کرنا"

پھر اُس کے گلے سے رُک رُک کر اللہ اللہ کی صدا نکلنے لگی۔

پھر وہ بھی بند ہوگئی۔

پھر ہچکی آئی اور ڈاکٹر صاحب نے اُس کی نبض چھوڑ کر کہا۔

"ختم ہوگیا"

لال خاں مجسٹریٹ نے بیان قلمبند کرتے کرتے اپنا قلم چھوڑ دیا تھا اُس کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ ڈاکٹر صاحب اور تھانے دار دونوں رو رہے تھے۔ چودھری خوشی رام ملک کی لاش سے لپٹا ہوا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔

مجسٹریٹ لال خاں نے اپنی کرسی چھوڑ دی۔ خود اس نے اپنے ہاتھ سے عطا محمد کی لاش کو چادر سے ڈھک دیا اور میرے پتا جی کا ہاتھ زور سے دباتے ہوئے کہا۔

"اِس ڈھکی کی پستیوں میں...... کیسی کیسی بلندیاں ہیں۔!"

پھر اُس اپریشن رُوم میں بہت سے لوگ ایک ساتھ کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھنے لگے۔

تھانے دار نیاز احمد میرے پتاجی کا بہت دوست تھا۔ دیکھنے میں وہ میرے پتاجی سے بھی بہت خوبصورت تھا۔ میرے پتاجی کی شکل وصورت بڑی اچھی تھی۔ ان کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ اور رنگ گندمی اور سانولے کے درمیان تھا۔

وہ ہر ایک سے بڑی نرمی اور مٹھاس سے بات کرتے تھے اور جس سے بات کرتے تھے اس کا دل موہ لیتے تھے۔

مگر تھانے دار نیاز احمد کی بات اور ہی تھی وہ کچھ اس طرح کا خوبصورت تھا۔ جیسے لوگ تصویروں میں خوب صورت ہوتے ہیں۔ اونچا پورا قد۔ چھ فٹ تین انچ کا جوان تھا۔ پتلی کمر، چوڑا چکلا سینہ۔ دانت سفید اور متناسب، چھوٹی چھوٹی بل کھاتی ہوئی مونچھیں۔ چوڑی پیشانی پر کسی پرانے زخم کا داغ، جو اس کی سپید پیشانی پر ایک مستقل تیوری کی طرح معلوم ہوتا تھا۔

چنانچہ جب وہ مسکراتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی سوچ میں ڈوبا ہوا آدمی

مسکرا رہا ہے۔ اس کی یہ ادا عورتوں کو بہت پسند تھی۔

تھانے دار نیاز احمد اکثر دَورے پر رہتا۔ مگر جب دورے سے واپس آتا تو میرے پتاجی کو ہر روز شام کو ملتا۔ ان دنوں میرے پتاجی بہت رات گئے نیچے گھر میں آتے۔ اوپر ہی ہسپتال کے اسپیشل وارڈ میں جو اکثر خالی نہ ہوتا تھا تو خالی کرا لیا تھا۔ میرے پتاجی اور تھانے دار نیاز احمد کی بیٹھک جمتی تھی۔ کیونکہ گھر میں ماں جی کا حکم چلتا تھا۔

گھر میں شراب پینے، اور گوشت کھانے کی ممانعت تھی اور میرے والد دونوں ہی چیزوں سے کبھی کبھی شوق فرماتے تھے۔

تھانیدار نیاز احمد جب دورے سے واپس آجاتا تو اُن کے دونوں شوق پورے ہو جاتے۔ دونوں دوست اسپیشل وارڈ میں بیٹھ کر خود مُرغ بھونتے۔ طرح طرح کے مسالے گوشت میں ڈال کر تجربے کرتے۔ گاتے، بہت رات گئے تک اُن کے قہقہوں کی آوازیں باغ میں آتیں۔

میری ماں کا چہرہ اُس روز اُڑا اُڑا سا رہتا اور وہ دیر تک برآمدے کے چوبی ستون سے لگی اور عشق پیچاں کی بیل کے قریب کھڑی میرے پتاجی کا انتظار کرتیں۔

رات کے کوئی گیارہ بجے اور کبھی ایک بجے کے قریب میرے پتاجی باغ کی نیلے ٹائیلوں والی روش پر جھُومتے جھُومتے گھر آتے ہوئے دکھائی دیتے اور ان کے ہونٹوں پہ یہ گیت ہوتا۔

"یہ ہٹی جب کان اس بن میں!"

میری ماں کو اس گیت سے چڑ تھی۔ گیت کیا تھا۔ بس یہی ایک مصرعہ تھا جو میرے والد شراب کے نشے میں اور شراب کے نشے کے بغیر بھی موج میں آکر گایا کرتے

تھے۔

" پھٹی جب کان اس بن میں "

اور میری ماں جھلا کر پوچھتیں۔

آخر اس گیت کا مطلب کیا ہے؟ جب دیکھو اسے گا رہے ہو۔۔۔۔۔۔"

" بھلی مانس "

میرے پتا اسکول کے ماسٹر کی طرح ایک انگلی اٹھا کر کہتے۔

" اس گیت کا مطلب ہے، پھٹی جب کان اس بن میں۔ یعنی جب کان اس بن میں پھٹ گئی، پھٹ گئی۔ کان نہیں جانتی ہو؟

کان یعنی لوہے کی کان، نمک کی کان، پتھر کے کوئلے کی کان! کوئی بھی کان ہو۔ جس کو بارود بھر کر اُڑایا جاتا ہے۔

کان سے مراد یہ تمہارا کان نہیں ہے جس میں یہ سونے کی بالیاں جھمک رہی ہیں۔ بھگوان کی سوگند جانکی، آج تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔ یہ رنگ و رُوپ تم کہاں سے لائیں۔ تمہاری ماں تو بڑی بدصورت تھیں "

" وہ کہاں بدصورت تھیں "

میری ماں غصے سے چڑ کر کہتیں "

وہ تو خوب صورت تھیں۔ کچھ بھی ہو تمہاری ماں سے اچھی تھیں! اے کاکا! تم یہاں کھڑے کیا سُن رہے ہو؟

تم سے دس بار کہا ہے جاؤ۔۔۔۔۔ بھاگو۔۔۔۔۔ سو جاؤ "

" یہ ابھی تک جاگ رہا ہے! "

میرے پتا میری طرف دیکھ کر میرے سر کے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہتے .....

"باپ بارہ بجے تک شراب پیئے گا تو بیٹا کیسے سوئے گا؟"

میری ماں غصّے سے بھڑک کر اصل مطلب پر آجاتیں ۔ وہ لڑنا چاہتی تھیں ۔ باپ طرح دینا چاہتے تھے ۔

نیاز احمد سے ملاقات کے بعد ہمیشہ اسی طرح ہوتا تھا ۔ مگر اس لڑائی سے پہلے مجھے سونے کے لیے بھیج دیا جاتا تھا ۔ پھر دونوں میاں بیوی برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھ کر لڑا کرتے تھے ۔ بہت اچھی لڑائی ہوتی تھی ۔

کیونکہ میرے والد پی کر بے حد شگفتہ ہو جاتے تھے اور بڑی جیداری سے میری ماں کی باتوں کا جواب دیتے تھے ۔

ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آتے ، بہت دور ڈھلوانوں سے پرے ندی کا پانی چاندی کی طرح چمکتا اور عشق پیچاں کے پھولوں کی مہک سے برآمدہ معطر ہوتا ۔ اس لئے نتھری نتھری سی پاکیزہ فضا میں لڑائی بھی بہت ستھری اور سلیقے سے ہوتی تھی ۔

شطرنج کے کھیل کی طرح اس لڑائی کے اصول بھی تھے ۔ ماں پہلے اُونچا بولتی تھیں ، میرے والد دبتے تھے ۔ پھر بیچ میں میرے والد اُونچا بولنے لگتے تھے ۔

آخر میں میری ماں روہانسی ہو جاتیں اور دھیرے دھیرے سسکنے لگتیں یہ ایک سگنل تھا کہ اب صلح ہو گی اس کے بعد میرے پتا آرام کرسی سے اٹھ کر آتے اور بڑے پیار سے میری ماں کا ہاتھ پکڑ کر بے حد لجاجت سے معافی مانگنے لگتے ۔

اس کے بعد میں کچھ نہ دیکھتا ۔ خوشی سے لحاف میں دبک کر سو جاتا ۔ جتنے دن نیاز احمد سے صحبت رہتی ، یہی کچھ ہوتا تھا ۔

نیاز احمد کی پہلی بیوی مرچکی تھی۔ لیکن اُس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ پہلی شادی سے ایک لڑکا تھا جو بڑے شہر میں پڑھتا تھا۔

نیاز احمد کی عمر پینتیس برس سے کم نہ ہوگی۔ لیکن دیکھنے میں وہ مشکل سے پچیس برس کا دکھائی دیتا تھا۔ وہ بڑا کسرتی نوجوان تھا اور جب صبح سویرے اپنے قلعے نما تھانے کی سیڑھیاں اُتر کر گھوڑا دوڑاتا ندی کے کنارے جاتا اور لنگوٹ باندھ کر کسرت کرتا تو صبح کی لطیف سنہری دھوپ میں اُس کا گورا بدن کندن کی طرح چمکتا تھا۔ اور سر پر گھڑے رکھے راہ چلتی عورتیں اُسے کنکھیوں سے دیکھتی جاتیں۔ گھبرا کر نظر جھکا لیتیں۔ پھر دیکھنے پر مجبور ہو جاتیں۔

پھر گھبرا کر نظر جھکا لیتیں اور ایک گہری آہ بھر کر اپنی راہ چلی جاتیں۔

نیاز احمد کو یہ معلوم تھا کہ اُس پر ایک ہزار ایک شادی شدہ عورتیں مرتی ہیں اچھے اچھے خاندان والے گھروں سے اس کے لیے شادی کے پیغام آتے تھے مگر وہ شادی نہ کرتا تھا۔

کیوں نہیں کرتا تھا۔ یہ بھی ایک راز تھا۔ جس کا صرف میرے پتا کو علم تھا۔ کچھ عرصے سے نیاز احمد کے معمول میں تبدیلی آچکی تھی۔ پہلے تو وہ لمبے دورے کیا کرتا تھا۔ اور مہینے میں صرف چار روز کے لیے واپس صدر مقام پر آتا تھا۔

اس لئے چار چھ روز کی بُری صحبت تو میری ماں میرے پتا جی کے لیے رو پیٹ کر گوارا کر لیتی تھی۔ لیکن ایک سال سے نیاز احمد کے دورے کم ہوتے جا رہے تھے۔ پہلے وہ مہینے میں صرف چار چھ روز کے لئے آتا تھا۔ پھر آٹھ دس روز کے لئے آنے لگا تھا۔ پھر بارہ پندرہ روز کے لیے۔ پھر بیس روز کے لیے قیام کرنے

لگا۔

اب گذشتہ چار ماہ میں وہ ایک بار بھی دورے پر نہیں گیا۔ یہ میری ماں کے لیے بڑی مصیبت کا وقت تھا۔

پھر ایک روز رات میں بڑی بھگدڑ مچی۔ فوج نے ہمارے بنگلے کا محاصرہ کر لیا۔ نہ صرف ہمارے بنگلے کا۔ بلکہ جہاں جہاں دوسرے افسر لوگ رہتے ہیں۔

اُن سب کے بنگلے فوج کے گھیرے میں لے لئے گئے اور ان سب کے گھروں کی تلاشی لی جانے لگی۔

سارے صدر مقام میں جگہ جگہ مشعلیں جلتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اور لوگ گھبرا کر اِدھر اُدھر جا رہے تھے۔ پولیس کے دستے گشت کر رہے تھے اور مختلف مکانوں کی تلاشیاں لے رہے تھے۔

پوچھنے سے معلوم ہوا کہ راجہ جی نے تھانے دار نیاز احمد کی گرفتاری کے حکام جاری کئے ہیں اور انعام بھی رکھا ہے۔

جو کوئی راجہ جی کے سامنے نیاز احمد کو زندہ یا مردہ پیش کرے گا۔ اُسے ایک ہزار روپے کا انعام دیا جائے گا۔

اسی سلسلے میں وزیر سے لے کر ڈاکٹر تک ہر بڑے آفیسر کے مکان کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ کیونکہ تھانیدار نیاز احمد آفیسروں میں بہت مقبول تھا۔

پولیس نے راتوں رات، تمام بنگلے، چپہ چپہ چھان ڈالا۔ مگر نیاز احمد کا کہیں پتہ نہ چلا۔

پولیس کے چلے جانے کے بعد دیر تک میری ماں اور باپ بستروں میں پڑے

گھسر پُسر کرتے رہے ۔ ان کے خیال کے مطابق میں سو رہا تھا۔
پھر بھی معاملہ اس قدر اہم تھا کہ وہ لوگ بہت دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے
دراصل قصّہ یہ تھا کہ نیاز احمد ہمارے ہی گھر میں چھپا ہوا تھا۔
میری ماں نے اسے پوجا کے کمرے میں رام اور سیتا کی مورتی کے پیچھے چھپا دیا
تھا۔
فوج کے لوگوں نے گو پوجا کا کمرہ بھی کھلوا کے دیکھا ۔ مگر وہ کمرے کے اندر نہ
گھسے ۔ صرف دروازے سے اندر جھانک کر ہی چلے گئے۔
کیونکہ وہ پوجا کا کمرہ تھا۔
اور وہ لوگ میری ماں کے سخت مزاج سے واقف تھے ۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا
کہ میری ماں اپنے دھرم کے اصولوں کی پابندی کتنی سختی سے کرتی ہیں ۔
چنانچہ اُنہیں اس بات کا شبہ تک نہ ہو سکتا تھا کہ میری ماں ایک مسلمان کو
اپنے پُوجا کے کمرے میں گھسنے دیں گی اور اپنے مقدس اشٹ دیو کی مُورتی کے پیچھے
چھپا دیں گی!
اور میری ماں واقعی ایسا کبھی نہ کرتیں۔ اگر میرے پتا جی لڑ جھگڑ کر انہیں اس بات
کے لیے مجبور نہ کر دیتے ۔
میرے باپ نے غصّہ میں آکر ندی میں ڈوب مرنے کی دھمکی دی تھی۔ اس
پر میری ماں راضی ہو گئیں۔ مگر فوج کے چلے جانے کے بعد وہ پھر دھیرے دھیرے
میرے باپ سے جھگڑنے لگیں۔
"میں تم سے کہتی ہوں اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ اپنی ملازمت سے ہاتھ

دھو بیٹھو گے۔"

"اور وہ بے چارہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اس کا خیال کچھ نہیں ہے۔"

"وہ اپنے کئے کی سزا پائے گا۔ کیوں اس نے ایسا کیا تھا؟"

"اس نے کہاں کچھ کیا تھا۔ جب راجہ کی بہن ہی اس پر عاشق ہو گئی، تو وہ کیا کرتا؟"

"کیا کرتا؟"

میری ماں غصہ سے بولیں۔

"اُسے منع کر دیتا۔ راجہ راجہ ہے ملازم ملازم ہے۔ پھر وہ ہندو وہ مسلمان اس کا پریمی نام کچھ اچھا نہیں ہو سکتا تھا۔"

اس سے دونوں کا دھرم بھرشٹ ہوتا!

"محبت دھرم نہیں دیکھتی۔"

"تم تو ناستک ہو۔ میں سمجھتی تھی تم آریہ سماجی ہو۔ تم ایک مسلمان کو اپنے گھر میں پناہ نہ دو گے۔ مگر تو تم تو آریہ سماجی سے بھی گئے گزرے۔ تم تو ٹھیٹ ناستک ہو!"

"دوستی بھی تو کوئی چیز ہے!"

"اور دھرم کوئی چیز نہیں ہے اپنے مذہب کا تمہیں کوئی خیال نہیں ہے۔ اُس کی یہ ہمت کہ تمہارے راجہ کی بہن سے پیار کرنے چلا ہے اور تمہاری یہ غیرت کہ گھر میں پناہ دے رہے ہو!"

"دوجانکی"

میرے باپ نے اپنے لبستر سے جھک کر زور سے میری ماں کی باہنہ پکڑ لی۔ اور انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تم جانتی ہو دوستی بھی ایک دھرم ہے۔ وہ خود ایک مذہب ہے۔ اُس کے اپنے اصول ہیں جس طرح تمہارے دھرم کے اصول ہیں۔"

میری ماں نے اپنی باہنہ چھڑاتے ہوئے کہا۔

"ہوں گے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم اپنے دھرم کے اُصولوں کو میرے دھرم کے اصولوں پر لاد دو۔"

"میں جس مندر میں تمہیں اشنان کئے بغیر نہیں جانے دیتی تھی۔ میں نے اسی مندر میں تمہارے مسلمان دوست کو چھپا لیا ہے۔"

"نہ جانے بھگوان مجھے اس کی کیا سزا دیں گے؟ کیونکہ میں نے اُن کا مندر بھرشٹ کر دیا ہے زندگی میں جو کام میں نے کبھی نہیں کیا تھا وہ بھی تم نے مجھ سے کروا لیا......"

"میری ماں رونے لگیں۔

پتاجی اُسے دلاسا دینے لگے۔

"چند دنوں کی بات ہے اس کے بعد جب معاملہ ذرا ٹھنڈا پڑ جائے گا اور پولیس کی دوڑ دھوپ کم ہو جائے گی تو وہ خود ہی ہمارا گھر چھوڑ دے گا اور اس علاقے سے بھاگ جائے گا۔"

یہاں تو اسے جان کا خطرہ ہے۔

"اس کی جان ہی کو نہیں تمہاری جان کو بھی خطرہ ہے۔ یہ مت بھولو کہ تم بھی راجہ جی کے ملازم ہو اور ملازم ہوتے ہوئے درپردہ ان سے غداری کر رہے ہو۔"

میں اب تم سے زیادہ نہیں کہتی۔ صرف اتنا کہتی ہوں کہ اپنے دوست سے کہہ دو کہ وہ سنکرانت سے پہلے یہاں سے اپنا منہ کالا کر جائے

سنکرانت کے دن میں اس مندر کو اپنے ہاتھوں گنگا جل سے دھو کر صاف کروں گی اور مشر جی کو بلا کر اکیس دن کی کتھا رکھوں گی۔

یگ کروں گی۔ ہون کروں گی۔ پراشچت کا بھوگ اکیس براہمنوں کو کھلاؤں گی۔ جب جا کے کہیں میرے دل کو چین آئے گا۔

"دوسرے کمرے میں کچھ آہٹ سی ہوئی" میرے پتا جی نے گھبرا کر کہا۔ آہستہ بولو۔

"کہیں وہ سن نہ لے۔"

"سن لے تو اچھا ہے!"

ماں اور بھی جھلا کے بلند آواز میں بولیں۔

ششش کہہ کر میرے پتا نے میری ماں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور پھر پھونک مار کر لیمپ بجھا دیا۔

ساتھ والے جس کمرے میں نیاز احمد کو چھپایا گیا تھا۔ اس میں پھر ذرا سی آہٹ ہوئی۔ پھر چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ اُن دونوں کمروں کے درمیان کا دروازہ دوسری طرف سے بند تھا۔ روشندان ذرا سا کھلا تھا ——

پتاجی نے ماں سے کہا۔

"کل صبح اِس روشندان کے شیشے پر سیاہی پھیر کر اسے بھی بند کرا دینا۔"

"بہت اچھا!"

میری ماں نے سرگوشی میں کہا۔

پھر وہ سونے سے پہلے منہ ہی منہ میں جاپ کرنے لگیں۔ یہ اُن کا روز کا دستور تھا!

دوسرے دن صبح کے وقت میری ماں سب سے پہلے اٹھیں۔ ابھی نوکر سوئے پڑے تھے کہ انہوں نے نیاز احمد کے لیے چائے اور ناشتے کا سامان تیار کر لیا اور سب چیزیں ایک ٹرے میں سجا کر پوجا کے کمرے میں لے گئیں۔ مگر فوراً ہی لوٹ آئیں انہوں نے جلدی جلدی بیڈ روم میں جا کر میرے والد کو جگایا۔ اور ان سے کچھ کہا۔

دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ میرے والد گھبرا کر بستر سے اٹھے۔ اور پاجامے کا ازار بند اڑستے ہوئے بولے۔

"کدھر؟ کہاں؟ کیسے؟"

میری ماں آہستہ سے بولیں۔

"تم خود چل کر دیکھ لو۔"

پتاجی بھاگے بھاگے پوجا کے کمرے میں گئے مگر وہاں نیاز احمد نہ تھا۔ کمرے کے عقب میں ایک کھڑکی کھلی تھی۔ وہ رات کی تاریکی میں کھڑکی کھول کر کہیں فرار ہو گیا تھا......

اُسی دن صبح کو آٹھ کے قریب قلعہ نما تھانے کی سیڑھیوں کے نیچے پکی

سڑک کے کنارے اُس کی لاش پائی گئی۔ کسی نے اُسے مار کر اس کی لاش کے چار ٹکڑے کر دیئے تھے اور کوئی اُسے زندہ یا مُردہ لانے کا انعام لینے بھی نہ آیا تھا۔

جس وقت میرے پتاجی نہا دھو کر ناشتہ کرنے لگے۔ ہسپتال کے اردلی نے اُنہیں اطلاع دی کہ تھانیدار نیاز احمد کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے لاش گھر آ چکی ہے۔

پتاجی نے گھُور کر غضب ناک نظروں سے میری ماں کی طرف دیکھا اور میری ماں نے خائف اور پشیمان ہو کر اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

پتاجی ناشتہ کیئے بغیر کمرے سے نکل گئے اور ماں کے ہاتھ سے چائے کا پیالہ فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔

اور وہ کرسی پر جھک کر رونے لگیں۔

میرے پتاجی نے دو دن تک کھانا نہیں کھایا۔ اور کئی دن تک میری ماں سے بات نہیں کی۔

پھر سنکرانت آ گئی اور میں حسب سابق سُنت ناجے یں تُلا۔ میری کوری دھوتی مترجی کو دے دی گئی۔ اور ماں مجھے گوردوارے لے گئیں۔

گوردوارے کے باہر والے مندر میں ہم نے گھنٹے بجائے اور پھر ہم وہاں سے مراد کے مزار کی طرف چل دیئے۔

لیکن آج میری ماں بہت اُداس تھیں۔

اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد نہ جانے کیا خیال کر کے آب دیدہ ہو جاتیں۔ جب ہم ڈھکی اُتر کر شاہ مراد کے مزار کے قریب پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مزار کے قریب کی سنسان یگ ڈنڈی پر شاہی محل کی ایک پالکی رکھی ہے اور اس کے گرد چار کہار کھڑے

ہیں۔

میری ماں شاہی ڈولی دیکھ کر وہیں ٹھٹھک گئیں اور مجھے لے کر ایک درخت کی اوٹ میں ہو گئیں۔ اور دیر تک چُپ چاپ کھڑی رہیں۔

انہوں نے چپکے سے کہا۔

"تُو بچہ ہے تجھے شاہی محل کے کہار جانے دیں گے۔ جا کے دیکھ تو سہی مزار پر کیا ہو رہا ہے؟"

میں اُن کی اجازت لیتے ہی بگ ٹٹ دوڑا اور پاؤں سے کنکر اُڑاتا پتھروں کو ٹھوکریں مارتا ہوا مزار کی طرف بڑھ گیا۔

جدھر گھنی بیریوں کا جھاڑ تھا۔

کہاروں نے تو مجھ سے کچھ نہیں کہا۔

لیکن جرتے نے مجھے دُور سے دیکھ لیا اور دیکھتے ہی اشارے سے وہیں رُک جانے کو کہا۔

میں ایک جھاڑی کے قریب رُک گیا۔ بلکہ دُبک کر چھپ گیا۔

میں نے سمجھا یہ بھی جرتے کا کوئی نیا کھیل ہے۔ جرا میرے پاس آکر آہستہ سے بولا۔

"مزار پہ کوئی نہیں جا سکتا اس وقت!"

"کیوں؟"

میں نے دھیرے سے پوچھا۔

جرتے نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

صرف اتنا کہا۔

"میں تم کو لے چلوں گا۔"

"کیسے؟"

میں نے پھر پوچھا۔

مگر جبرے نے پھر میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر سنتھے کی جھاڑیوں کے پیچھے سے گھٹنوں کے بل چل کر کہیں مڑ کر کہیں دبک کر بیریوں کے جھنڈ کے اندر لے آیا۔

وہاں ہم دونوں دبک کر بیٹھ گئے اور بیریوں کی شاخیں ہٹا کر دیکھنے لگے۔

چاچا رمضانی مزار کے قریب بیٹھے تھے۔ اُن کے سامنے سفید بُرقعے میں ایک عورت کھڑی تھی۔

"شاہی محل کی رانی ہوگی۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔

اور ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

کیونکہ عام طور پر مسلمان عورتیں برقعہ پہنتی ہیں اور وہ بھی کالا ہوتا ہے۔ سفید بُرقعہ صرف ہندو عورتیں پہنتی ہیں۔ جو شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔

چاچا رمضانی کی گھگی بندھی ہوئی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سفید بُرقعہ والی عورت کو دیکھ رہا تھا۔

اور اس کا تسبیح والا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

بُرقعے والی عورت نے تحکمانہ لہجے میں اس سے کہا۔

"تم میری آمد کا کسی سے ذکر نہیں کرو گے۔"

رمضانی نے نفی میں سر ہلایا۔

"اور تم سب نذر و نیاز دو گے۔"

رمضانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور تم قبر پہ روز دیا جلاؤ گے۔ پھول چڑھاؤ گے۔ اور وہ سب کام کرو گے جو اس سلسلے میں کئے جاتے ہیں۔"

رمضانی نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

سفید برقعے والی عورت دیر تک برقعہ کے اندر سے رمضانی کو گھورتی رہی۔ اس کے بعد برقعے کے ایک کونے سے دو تین پتلی پتلی نازک سی مخروطی انگلیاں پل بھر کے لیے باہر نکلیں پھر برقعے میں چھپ گئیں اور سو کے کئی نوٹ رمضانی کی جھولی میں گر پڑے۔

رمضانی جلدی جلدی تسبیح پھیرنے لگا۔

"قبر کہاں ہے؟"

اس عورت نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

چاچا رمضانی آنکھ کے ایک کونے سے صرف ایک اشارہ ہی کر سکا۔ مگر عورت نے سب سمجھ لیا۔ اور وہ بڑے مضبوط قدموں سے چلتی ہوئی مزار کی سیڑھیاں اُتر کر قبرستان میں چلی گئی۔

اب میں اور حرا بھی منہ موڑ کر قبرستان کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ عورت ایک قبر کے قریب جا کر رُک گئی اور دیر تک وہیں خاموش کھڑی رہی پھر

وہ یکایک اُس پر گر پڑی اور اس کے دونوں ہاتھ قبر پر پھیل گئے۔

اور اُن ہاتھوں کی انگلیاں قبر پر اس طرح تڑپنے لگیں۔ جس طرح بہت ہی پتلے پانی میں مچھلیاں تڑپتی ہیں۔ پھر وہ انگلیاں بھی ساکت ہو گئیں۔

اور یکایک بیریوں میں گہرا سناٹا چھا گیا۔ مزار پر اندھیرا سا ہو گیا۔

اور چاچا رمضانی کی تسبیح کے دانے کانپنے لگے اور میں اور جرا حیرت اور خوف سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگا۔

ایک لمبے سکوت کے بعد وہ عورت وہاں سے اٹھی لیکن اب اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور اس کا سفید بُراق برقعہ بھوری مٹی سے اٹا ہوا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی ہانپتی کانپتی ہوئی جھاڑیوں اور چٹانوں سے اُلجھتی ہوئی مزار کے اُوپر کی پگڈنڈی پر پہنچ گئی۔ اور کسی سے کچھ کہے بغیر پالکی میں بیٹھ گئی۔

کہاروں نے پالکی کا پردہ گرا دیا۔

اور اُسے اٹھا کر چل دیئے! اور چند لمحوں میں ہماری نظر سے غائب ہو گئے۔

بیمار باپُو

اب یہ بات دوستوں پر کُھل چکی تھی مہتہ چاہتا ہے کہ اس کا باپ جلد سے جلد مر جائے!

چندر کانت مہتہ ہمارا دوست تھا اور ہمارا ہمسایہ بھی تھا۔ وہ دُبلا پتلا اُونچے لانبے قد کا اُدھیر عمر کا ایک دلال تھا۔

جو کرایہ کے مکانوں یا اونرشپ فلیٹوں کی دلالی کرتا تھا۔ اور پالی پارک میں رہتا تھا۔

پالی پارک کے نئے بنگلوں میں جتنے کرایہ دار آتے تھے۔ اُسی کی معرفت آتے تھے اور جو نئے بنگلے بن رہے تھے اُن کے کرایہ دار بھی اُسی کی معرفت آئیں گے۔

اس کا بھی ہمیں علم تھا۔ کیونکہ چندر کانت مہتہ سیٹھ خوب چند کو خوب اچھی طرح جانتا تھا اور سیٹھ خوب چند ان تمام بنگلوں کا مالک تھا۔

اسی لئے چندر کانت مہتہ نے دن رات خوشامد کر کے اور مسکہ لگا لگا کر سیٹھ خوب چند کو

اپنی مٹھی میں لے لیا تھا۔

حالانکہ سیٹھ خوب چند بے حد بدزبان اور تیز مزاج سیٹھ تھا۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ کھُردری سے کھُردری طبیعت میں خوشامد کا مکھن لگانے سے چکناہٹ پیدا ہوجاتی ہے اور اگر نہیں جانتے ہیں تو ایک دن جان جائیں گے۔

بہر حال چندر کانت مہتہ کو زمانے کی تلخیوں نے یہ گُر اچھی طرح سکھا دیا تھا لیکن اس دنیا میں صرف خوشامد کافی نہیں ہے۔

نئے مکانوں کی تعمیر بھی ضروری ہے۔ اگر نئے مکان نہ بنیں گے تو نئے کرایہ دار اُن میں کیسے آکر لبیں گے؟

ان دنوں مکانوں کی قلت کا یہ حال ہے کہ ایک بار جو کرایہ دار ایک مکان میں آکے لبس گیا۔

بس وہاں سے جانے کا نام ہی نہیں لیتا۔

پچھلے زمانے میں سُنا ہے کہ کرایہ دار انتہائی شریف اور مہذب ہوا کرتے تھے مالک مکان کے ایک ہی نوٹس پر گھر خالی کر دیا کرتے تھے۔

آج کل کے کرایہ دار دس بار مقدمہ کرنے پر بھی نہیں نکلتے یہ کوئی انسانیت ہے؟

آخر چندر کانت مہتہ کہاں جائے؟

اُسے ہر ماہ اپنے گھر کے خرچ کے لیے ایک ہزار روپیہ چاہیئے۔ اور مکانوں کی دلالی سے اور دوسرے چھوٹے کاموں سے اُسے مشکل سے چار پانسو روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔

باقی رقم وہ ہر ماہ کہاں سے لائے۔ اس لئے وہ بیچارہ ہمیشہ مقروض رہتا ہے۔

کیونکہ چندر کانت مہتہ کے پاس ایک خوبصورت گڑیا سی بیوی ہے اور ایک خوبصورت ننھی سی کار ہے۔ اس لئے جب وہ بڑے پیار سے بیبی کہہ کر آواز دیتا ہے۔ تو اکثر یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ اپنی بیوی کو بلا رہا ہے یا اپنی کار کو!

جب ایک گھر میں دو چیزیں جمع ہو جائیں تو اسی طرح کی گڑبڑ ہوتی ہے۔ خصوصاً جب صاحب کو ایک ہی نام سے دونوں کو پکارنے کی عادت ہو۔

اُس وقت ہم لوگ جو اس کے ہمسائے ہونے کا شرف رکھتے ہیں۔ محض اُس کی گفتگو سے اندازہ لگایا کرتے ہیں کہ روئے سخن کدھر ہے۔

"آج میں نے بیبی کے لئے عمدہ ساڑی خریدی ہے!"

ظاہر ہے اس وقت بیبی سے مطلب اُس کی بیوی سے ہے۔ ورنہ گاڑی کو ساڑی کون پہناتا ہے۔

ساڑی کو گاڑی میں تو سبھی بٹھاتے ہیں۔ لیکن گاڑی کو ساڑی کون پہناتا ہے؟ یا جیسے وہ ہم سے یوں ہم کلام ہوتا ہے۔

"ابھی کل ہی کی بات ہے کہ میں اپنی بیبی کو دھو رہا تھا کہ اتنے میں....."

ہم سمجھ جاتے ہیں کہ اس وقت بیبی سے مُراد گاڑی ہے۔ بیوی نہیں ہے۔ لیکن کبھی کبھی بڑا گھپلا ہوتا ہے۔

"میری بیبی کے چوٹ آگئی۔"

اب سمجھ میں نہیں آتا کہ مسز مہتہ کے .... پاؤں میں موچ آگئی ہے۔

یا کار کو ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے یا۔

"آج بیبی نے مجھے راستے میں بہت پریشان کیا۔"

۔ اب راستے میں بیوی بھی پریشان کر سکتی ہے اور گاڑی بھی۔ اور ہم سوچتے ہی رہ جاتے ہیں کہ کیا بات ہوئی۔ بیوی کے مزاج کا پارہ تیز تھا یا گاڑی کی بیٹری ڈاون تھی۔

ایسے موقعوں پر بھی انتہائی سنجیدگی سے صرف ہوں۔ ہاں کہہ دینا ہی بہتر ہوتا ہے!

بیبی کے علاوہ چندر کانت مہتہ کا پسندیدہ موضوع اس کے باپ کی علالت ہے۔

اُس کا باپ چمن مہتہ پچاس برس کا بڈھا ہے۔

بیٹے کی طرح دُبلا پتلا۔

بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ سُوکھا۔ اپنے بیٹے ہی کی طرح چمن مہتہ لانبا ہے۔ لیکن اُس کی آواز اس شدید علالت کے باوجود پاٹ دار اور کرارتی ہے۔

بیٹے کی آواز میٹھی اور لچک دار ہے۔ چندر کانت کی آواز سنتے ہی خیال ہوتا ہے کہ ایسے آدمی کو یا تو دلاّل ہونا چاہیئے۔ یا شہد کی مکھیاں پالنے کا بیوپار کرنا چاہیئے۔ لیکن اس کے باپ چمن مہتہ کی کرارتی آواز سے اس کے دولت مند ہونے کا اور اس کے کنجوس ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

باپ بیٹے دونوں ایک بنگلے میں پالی پارک میں رہتے ہیں۔

چندر کانت مہتہ دونوں دن رات بڈھے کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ بڈھے کا سارا جسم سُوکھ گیا ہے۔

پیروں پر ورم آگیا ہے۔ آنکھوں سے بہت کم دکھائی دینے لگا ہے۔ لیکن پھر بھی سانس کی آمد و رفت جاری ہے اور گردن اتنی سُوکھ گئی ہے کہ سانس نرخرے سے آتا جاتا دکھائی دیتا ہے۔

بُڈھا اس پر بھی زندہ ہے اور جئے جاتا ہے اور بیماری کا مقابلہ کئے جاتا ہے اس کے دو بیٹے اور بھی ہیں۔

لیکن اب وہ اپنے بڈھے باپ کی خدمت نہیں کرتے۔ کیونکہ بڈھا تو دس سال سے بیمار ہے۔

اور وہ دونوں بیٹے پہلے ہی چار سالوں میں اُس کی خدمت کرتے کرتے تھک گئے۔

ہر جذبے کی میعاد ہوتی ہے۔ ایک عمر ہوتی ہے۔ جہاں پہنچ کر وہ دم توڑ دیتا ہے اُن دو بیٹوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

آخر میں بڈھے نے چندر کانت مہتہ کی خدمت پر خوش ہو کر اپنے دونوں بیٹوں کو جائیداد سے بے دخل کر دیا۔

کیونکہ یہ جائیداد پشتینی نہ تھی۔ بڈھے کی اپنی پیدا کردہ تھی۔

دوسرے دونوں بیٹوں کو اس کا بہت غم تھا۔ اور دونوں غم و غصے میں آکر اپنے بھائی چندر کانت کو مورد الزام ٹھہراتے تھے۔

اور اکثر لوگوں سے کہتے پھرتے تھے کہ ہمارے بھائی نے جائیداد کے لالچ میں آ کر ہمارا گلہ کاٹا ہے۔

چندر کانت نہایت خاموشی سے اُن کی باتیں اور اُن کے طعنے سنتا اور پھر اپنے بڈھے

باپ کی خدمت نہیں کر سکتا۔ جتنی خدمت چندر کانت کرتا تھا۔
اور وہ بڑے فخر سے اپنے اِس کارنامے کو دوستوں میں بیان کیا کرتا تھا۔
چندر کانت خاصا مذہبی آدمی بھی تھا۔ اور اسے لیکچر سننے اور سنانے کا بھی شوق تھا۔

اکثر دھارمک مجلسوں میں وہ رامائن سے مثالیں دیتے ہوئے اپنی تقریر میں ماں باپ کی خدمت کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے اپنے بڈھے باپ کی علالت کا ضرور ذکر کرتا تھا۔
لوگ اس کی اس بے ضرر سی کمزوری کو معاف کر دیتے تھے۔
آخر جو بیٹا اتنے سال خدمت کرے گا۔ کیا اُسے اپنی خدمت کے صلے میں خود ستائی کے دو لفظ کہنے کا حق نہ ہوگا۔

چندر کانت مہتہ اور مسز مہتہ بڈھے باپ کے خریدے ہوئے بنگلے میں رہتے تھے کسی زمانے میں بڈھے باپ کو پرانے ٹائپ کا فرنیچر جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔
اس لئے اس کا بنگلہ اِس قسم کے فرنیچر سے پٹا پڑا تھا۔ مسز مہتہ اور اپنے بیٹے کو بوڑھے نے دو کمرے دے رکھے تھے۔
باقی سب کمروں میں اس کا سامان پڑا تھا۔ اور کوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر اِدھر اُدھر نہ ہو سکتی تھی۔
مسز مہتہ اس بات سے بہت کڑھتی تھی اور کبھی کبھار اپنی سہیلیوں سے گفتگو کرتے وقت اس کی زبان سے ایسے فقرے نکل جاتے۔
" دیکھنا ایک دن میں اس بنگلے کو کیسا سجاؤں گی ؟"
اس سجانے کے پس منظر میں چھپے اس کے دل کے ارمان کھل کر سامنے آجاتے تھے۔

لیکن یوں کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ ورنہ مسز مہتہ ایسے معاملات میں بے حد محتاط رہتی تھی۔ اور بڈھے کو بھی اس بات کا پورا یقین تھا کہ اس کی بہو اور اس کا بیٹا دوسرے ناخلف بیٹوں کی طرح نہیں۔

سچے دل سے اور سچی لگن سے بڈھے باپ کی خدمت کرتے ہیں۔

گو بڈھے نے اپنے پہلے دونوں بیٹوں کو بے دخل کر دیا تھا۔ پھر بھی گھر پر اُس کا پورا کنٹرول تھا۔

تمام ضروری کاغذات، ہنڈیاں، تمسکات، زیور اور نقد روپیہ وہ ایک تجوری میں بند کر کے رکھتا تھا۔

تجوری بڈھے کے کمرے میں رہتی تھی اور چابیاں بڈھے کے تکیئے کے نیچے، اور بڈھا اس قدر شکی مزاج تھا کہ اگر اس کا اپنا بیٹا بھی کبھی بند تجوریوں کی طرف دیکھ لیتا تو بڈھے کی آنکھوں میں شک و شبہے کا طوفان اُٹھنے لگتا۔ اور اس کے سانس کی آمدورفت تیز ہو جاتی۔

اپنی علالت کے دوران میں بڈھا آہستہ آہستہ کمزور ہوتا گیا۔

پہلے تو وہ بستر سے اُٹھ سکتا تھا۔ اور دروازہ بند کر کے اپنے بیٹے اور بہو کو باہر نکال کر تجوری کھولتا تھا۔

اور تجوری کے اندر دولت کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کرتا تھا۔ پھر وہ دن بھی آ گیا۔ جب بستر سے اٹھنا بھی اس کے لیے ممکن نہ رہا۔

اُس دن کے بعد تجوری کبھی نہ کھلی۔

بڈھے نے یوں تو کبھی کچھ نہ کہا۔

لیکن ...... بڈھے کی آنکھوں کی حریص چمک کہے دیتی تھی کہ تجوری کی طرف کوئی جائے بھی نہیں۔

بہو نے غالباً اس کا خیال بھانپ لیا تھا۔ اسی لئے اس نے اور بیٹے نے تجوری کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

کبھی کبھار شاید چور نگاہوں سے وہ اس تجوری کو دیکھ لیتے ہوں گے۔ جس کے اندر ان کا مستقبل بند تھا۔ لیکن صاف کھلے انداز سے اُسے دیکھنے کی جرأت انہیں کبھی نہ ہوئی۔

چندر کانت مہتہ تو بڈھے کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا تھا اور بڈھے کے پاس بیٹھ کر پاؤں دابنے لگتا۔

اور بڈھا ہولے ہولے کہ نسے لگتا مین بدھا کچھ بھی کرتا۔

اس کی بے بس اور مجبور نگاہیں تجوری ہی کی طرف چلی جاتیں اور پھر وہیں جم جاتیں۔ پہروں، گھنٹوں وہ اپنی تجوری کو دیکھا کرتا۔

جس میں اس کی زندگی کا اثاثہ بند تھا۔

گو اب وہ اسے ہاتھ تو نہ لگا سکتا تھا اور نہ اُسے کھول کر دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اُسے اس بات کا بھروسہ تھا کہ جب تک وہ زندہ ہے نہ تجوری کھلے گی، نہ اس کی زندگی میں اس کی کمائی پر کوئی ہاتھ صاف کرے گا۔

دھیرے دھیرے بڈھا کمزور ہوتا گیا۔ دھیرے دھیرے تجوری پر گرد و غبار کی تہیں چڑھتی گئیں۔

اور وہ منحوس، بدصورت، زنگ آلود تجوری ایک سنگین قبر کی طرح تاریک نظر

آنے لگی۔

مکڑی نے اس پر ایک جالا بنالیا تھا۔ اور وہ خود بڈھا بھی۔ اپنے میلے بستر پر پڑا ہوا نحیف آواز میں کھانستا رہتا تھا۔ لیکن چندر کانت جبتہ اپنے بڈھے باپ کی خصلت سے واقف تھا اس نے کبھی بھول کر بھی، ایک بار بھی، اپنے بڈھے باپ سے روپے نہیں مانگے۔ خود دن رات محنت کی۔

قرضہ لیا۔

اِدھر اُدھر سے مانگ کے اپنے دن نکالے۔

لیکن تجوری کو کھولنے کی استدعا کبھی نہ کی۔

اُسے معلوم تھا کہ یہ استدعا اس کا وقار اس کے باپ کی نظروں میں ہمیشہ کے لئے ختم کر دے گی۔

اس کے دونوں بھائی جائیداد سے بے دخل ہو چکے تھے۔

اب تو یہ ساری کی ساری دولت صرف اس کے حصّے میں آنے والی تھی۔ صرف بڈھے کے مرنے کا انتظار تھا۔

لیکن چندر کانت نے کبھی بڈھے پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ کس شدت سے کس سچائی سے، کس لگن سے وہ بڈھے کی موت کا انتظار کر رہا تھا۔

بظاہر وہ ہر لحظہ بڈھے کے سامنے اور اپنے دوستوں کے سامنے بڈھے کی صحت کی دعائیں مانگا کرتا۔

جس لگن سے وہ بڈھے کی خدمت کرتا تھا۔ اُسی شدت سے اس کے دل میں بڈھے کی موت کی آرزو اپنے پاؤں پھیلائے جاتی۔

کبھی کبھی تو شدتِ انتظار سے اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے اور نگاہیں جھکا کہ ایسا نہ ہو کہیں دل کے اندر چھپا ہوا جذبہ آنکھوں کے چور دروازے سے جھلک کر باہر آجائے۔

کبھی کبھی تو وفورِ جذبات سے اُس کا دل گھبرانے لگتا۔

ایک مکڑی بستر پر ہے۔ ایک مکڑی تجوری پر ہے۔

کیوں نہیں وہ ہاتھ کے ایک ہی جھٹکے سے ان جالوں کو توڑ کر اس دولت پر قبضہ کر لیتا۔

جو اخلاقی اعتبار سے اب اس کی ہو چکی ہے۔

مگر نہیں ٹھہر، اے دلِ بے تاب ٹھہر۔

اگر پھل خود ہی پک کر اس کی جھولی میں گرنے والا ہو تو درخت پر چڑھ کر شاخوں سے اُلجھنے کی کیا ضرورت ہے۔

کیا کیا اس کے دل میں ارمان تھے۔

وہ ان پُرانے مکانوں کی دلالی سے عاجز آچکا تھا۔

وہ سٹے کے داؤ پر ایک ہی بار بیس ہزار لگا کر لاکھوں کمانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا مجہول باپ اب تک زندہ تھا۔ اور زندہ چلا آرہا تھا۔

ایک ہی سانس تھی جو گلے میں اٹکی ہوئی تھی۔ لیکن کسی طرح یہ سانس باہر نہ نکلتی تھی کبھی کبھی یہ سانس خود اُسے اپنے گلے میں پھانسی کی رسّی کی طرح چبھتی معلوم ہوتی تھی۔

باپ کی خدمت میں اُس کے انہماک میں ایک [illegible] طرح کا جذبہ بلکہ مسکہ شامل تھا۔

جیسے اس کی رُوح کا ذرہ ذرہ پچاس سالہ باپ کی ضد کیخلاف احتجاج کر رہا
ہو۔ کیوں نہیں مرجاتے تم، میرے باپ!
کیوں نہیں تم جسم کا مکان خالی کر دیتے؟ کرایہ دار آتے ہیں۔ کرایہ دار جاتے ہیں۔
لیکن تم اپنا فلیٹ کیوں نہیں خالی کرتے؟
پچاس سال ہو گئے ہیں تمہیں اس جسم میں رہتے ہوئے۔
اب جاؤ تاکہ میں دلالی کر سکوں اور نیا بزنس کھول سکوں۔
مگر بڈھے کو معلوم تھا کہ جسم ایک ایسا فلیٹ ہے جو ایک بار خالی کر دینے پر
کبھی بسایا نہیں جا سکتا اس لئے وہ گذرتے ہوئے وقت کی طرف رینگتے ہوئے بھی وقت
کے ایک ایک پل سے لڑ رہا تھا۔ اور اپنی زندگی پر جھپٹ رہا تھا۔
اس کی گرسنہ نگاہوں میں زندہ رہنے کی ایسی چاہ تھی کہ موت بھی اس کا سامنا کرتے ہوئے
گبھراتی تھی۔

پھر وہ دن آگیا۔
جب بڈھا بے حد کمزور اُس کے کان بہرے ہو گئے۔
نبض جواب دے گئی۔
ڈاکٹروں نے کہا۔
بڈھا اب چند لمحوں کا مہمان ہے۔
فرماں بردار بیٹے نے وفورِ غم سے اپنے آنسو پونچھے اور پہلی بار بند تجوری کی طرف
جرأت آزما نگاہوں سے دیکھ سکا۔
اور جس وقت بیٹے نے تجوری کی طرف دیکھا۔

اسی وقت باپ نے بیٹے کی طرف دیکھا اور بیٹے کی وہ نگاہ ایک تیر کی طرح باپ کے سینے میں گھستی چلی گئی۔

اور یکایک اُسے ایسا محسوس ہوا۔

جیسے کسی نے باپ کی حسرت محسوس کی۔ جانے والی محبت کا رنگ و روغن نوچ لیا۔

اور اس کے بیٹے کے ننگے جذبات کو اس کے سامنے کھڑا کر دیا۔

بڈھے کے جسم میں ایک خفیف سی جھرجھری ہوئی۔ اور اس کی بے بس مجبور آنکھوں کی حریصانہ چمک غم و غصّے کے شعلے میں تڑپنے لگی۔

اب جسم خاکی کے کسی کونے میں شاید کہیں جان باقی نہ تھی۔ صرف ماتھا گرم تھا۔ اور سانس چل رہی تھی۔

اور وہ بھی رُک رُک کر چل رہی تھی۔ صرف آنکھیں روشن تھیں۔ اور ان میں ایک غیر معمولی چمک تھی۔ جو ہر لحظہ بڑھتی جاتی تھی۔

جیسے لَو ختم ہونے سے پہلے ایک بار بلند ہو جائے۔

بیٹے نے باپ کی نگاہ نہیں دیکھی۔ ورنہ وہ گھبرا جاتا۔

اس وقت وہ اپنے دوستوں کے گروہ میں کھڑا اُس کمرے میں آہستہ آہستہ کسی سے چندن لانے کے لیے کہہ رہا تھا۔

کسی سے پنڈت کو بلانے کے لیے تاکید کر رہا تھا۔

کسی کو گھی کا آرڈر دے رہا تھا کسی کو نئے کفن۔ کسی کو چتا کی لکڑیوں کا۔

دھیرے دھیرے انتہائی رازدارانہ لہجے میں وہ اپنے دوستوں سے اپنے بہتے ہوئے

آنسوؤں کے درمیان اس طرح بات کر رہا تھا۔

جیسے اس کا باپ مُردہ ہو۔

آج سے وہ اس گھر کا مالک ہو۔ اُس کے بولنے کے لہجے میں اور اس کے چلنے کے انداز میں غیر شعوری طور پر ایک خاص جھلک پیدا ہو جاتی تھی۔

سب دوست آ جا رہے تھے۔

عورتیں رونے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ بہو کو دلاسے دے رہی تھیں۔ لوگ مختلف گروپوں میں بنگلے کے اندر اور باہر کھڑے مختلف باتیں کر رہے تھے۔ اور بڈھے کے مرنے کا انتظار کر رہے تھے۔

جس میں اب ڈاکٹر کے کہنے کے بموجب چند لمحوں کی دیر تھی۔

وہ چند لمحے، چند منٹ بھی گزر گئے۔

چند منٹ گھنٹوں میں تبدیل ہوتے گئے۔

بڈھا اُسی حالت میں لیٹا تھا۔ اُسی طرح اس کی سانس چل رہی تھی۔ نبض واپس نہ آئی تھی۔ لیکن آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی تھی۔

ایک بار جو بڈھے نے تجوری سے نظر ہٹا کر شعلہ بار نگاہوں سے بیٹے کی طرف دیکھا تو بیٹا یکایک گھبرا گیا۔

یکایک اُسے معلوم ہوا کہ جس راز کو اس نے اتنے سال سے اپنے باپ کی نظروں سے بچا کر رکھا تھا۔ وہ آج ایک ہی نگاہ میں افشا ہو گیا ہے۔

اب دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے پر تھیں۔ باپ کی بیٹے پر اور بیٹے کی باپ پر۔ دونوں دشمن آمنے سامنے کھڑے تھے، بیچ میں دولت تھی!

جب صبح کے پانچ بج گئے تو ڈاکٹر کو بڈھے کی نبض واپس آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ سب لوگوں نے بیٹے اور بہو کو مبارکباد دی۔ ہمسائے رات بھر کے جاگے ہوئے تھے۔ سب لوگ اپنے اپنے گھر جاکر سو گئے۔

صبح نو بجے کے قریب بڈھے کے بنگلے سے آہ و پکار کی صدائیں بلند ہوئیں اور لوگ گبھرا کر نہیں، بلکہ اطمینان سے اپنے اپنے گھروں سے نکلے، سب کے چہروں پر ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ آخر وہ گھڑی آپہنچی جس سب کو انتظار تھا۔ سب لوگ بھاگے بھاگے بنگلے کے دروازے تک پہنچے۔

آدرنان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"کیا بڈھا مر گیا۔؟"

بنگلے کے پٹھان دربان نے سر ہلا کر کہا۔

"نہیں جناب بڈھا تو زندہ ہے اُس کا بیٹا مر گیا ہے! ابھی ابھی اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔!!"

پہلا دن

آج نئی ہیروئن کی شوٹنگ کا پہلا دن تھا۔

میک اپ روم میں نئی ہیروئن سُرخ مخمل کے گدے والے خوبصورت سٹول پر بیٹھی تھی اور ہیڈ میک اپ مین اُس کے چہرے کا میک اپ کر رہا تھا۔

ایک اسسٹنٹ اس کے دائیں بازو کا میک اپ کر رہا تھا۔ دوسرا اسسٹنٹ بائیں بازو کا تیسرا اسسٹنٹ نئی ہیروئن کے پیروں کی آرائش میں مصروف تھا۔

ایک ہیر ڈریسر عورت اس کے بالوں کو ہولے ہولے کھولنے میں مصروف تھی۔ سامنے سنگار میز پر پیرس، لندن اور ہالی وڈ کا بنا ہوا سنگار کا سامان بکھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔

ایک وقت وہ تھا۔ جب نئی ہیروئن کو معمولی جاپانی لپ سٹک کے لیے بھی ہفتوں اپنے شوہر سے لڑنا پڑتا تھا، اس کا شوہر مدن میک اَپ روم کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا خاموشی سے یہی سوچ سوچ کر مسکرا رہا تھا۔ کیسی مشکل زندگی تھی۔ اُن دونوں کی......

آج سے تین سال پہلے مدن دہلی میں کلرک تھا۔ تھرڈ ڈویژن کلرک۔ ایک سو ساٹھ روپے تنخواہ پاتا تھا۔

ناداری اور تنگی کی زندگی تھی۔ کبھی کوٹ کا کالر پھٹا ہے۔ کبھی قمیص کی آستین۔ کبھی بلاؤز کی پشت۔

آگے پیچھے جدھر سے وہ دہلی کی زندگی کو دیکھتا تھا۔ اُسے وہ زندگی کٹی پھٹی، بوسیدہ اور تارتار نظر آتی تھی۔ لیکن ایسی زندگی جس میں کوئی آسمان نہیں ہوتا۔ کوئی مسکراہٹ نہیں ہوتی۔ کوئی پھول نہیں ہوتا۔

ایسی نیم فاقہ زدہ۔ جھلاتی کھسیاتی زندگی جو ایک پرانی بدبودار ترپال کی طرح دنوں مہینوں اور برسوں کے کھونٹوں سے بندھی ہوئی ہر وقت احساس پر چھائی رہتی تھی۔ مدن اس کے ہر کھونٹے کو توڑ دینا چاہتا تھا اور کسی موقع کی تلاش میں تھا۔

یہ موقع اُسے ملک گردھاری لال نے دے دیا۔ ملک گردھاری لال اس کے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ انہیں دنوں دفتر میں ایک اسسٹنٹ کی نئی آسامی منظور ہوئی تھی۔

مدن نے بھی اس کے لیے درخواست دی تھی۔

مدن سینئر تھا اور لائق بھی تھا۔

اور ملک گردھاری لال کا چہیتا بھی تھا۔

ملک گردھاری لال نے جب اس کی درخواست پڑھی تو اُسے اپنے پاس بلایا اور کہا۔

"مدن تمہاری عرضی میں کئی نقص ہیں۔"

"تو آپ ہی کوئی گُر بتائیے۔"

ملک گردھاری لال نے قدرے توقف کے بعد مدن کی عرضی اسے واپس کرتے ہوئے کہا۔

"آج رات میں تمہارے گھر آؤں گا اور تمہیں بتاؤں گا۔"

مدن بے حد خوش ہوا۔ گھر جا کے اُس نے اپنی بیوی پریم لتا سے خاص طور پر اچھا کھانا تیار کرنے کی فرمائش کی۔

پریم لتا نے بڑی محنت سے روغن جوش پنیر مٹر آلو گوبھی اور گھیوں والا پلاؤ تیار کیا۔

سرِ شام ہی ملک گردھاری لال مدن کے گھر آگیا۔ اور ساتھ ہی وہسکی کی ایک بوتل بھی لیتا آیا۔

پریم لتا نے جلدی سے پاپڑ تلے۔

بیسن اور پیاز کے پکوڑے تیار کئے اور پلیٹوں میں سجا کر بیچ بیچ میں خود آکر انہیں پیش کرتی رہی۔

چوتھے پیگ پہ وہ پالک کے ساگ والی پھلکیاں پلیٹ میں سجا کے لائی تو ملک گردھاری لال نے بے اختیار ہو کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بولا۔

پریم لتا تو بھی بیٹھ جا۔

آج ہمارے ساتھ وہسکی کی ایک چُسکی لگا لے۔ تیرا پتی میرا اسسٹنٹ ہونے والا ہے۔"

پریم لتا سر سے پاؤں تک کانپنے لگی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے کیوں کہ آج تک اُس کے خاوند کے سوا کسی نے اُسے اس طرح ہاتھ نہ لگایا تھا۔

پھلکیوں کی پلیٹ اُس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گئی۔

مدن نے گرج کر کہا۔

"ملک گردھاری لال! میری بیوی کو ہاتھ لگانے کی ہمت تجھے کیسے ہوئی؟"

مدن کا چانس مارا گیا۔

اس کی بجائے سردار اوتار سنگھ اسسٹنٹ بھی بن گیا۔ پھر چند دن بعد کسی معمولی غلطی کی بنا پر مدن کو نوکری سے الگ کر دیا گیا۔

اس نے کئی مہینے تک دہلی کے دفتروں میں ٹکریں مارنے کے بعد بمبئی آنے کی ٹھانی۔ کیوں کہ اُس کی بیوی بڑی خوبصورت تھی۔

مدن کے دوستوں کا خیال تھا کہ پریم لتا اتنی ہی حسین ہے جتنی کہ نسیم "پکار" میں تھی۔

وحیدہ رحمان "پیاسا" میں تھی۔

مدھوبالا "مغلِ اعظم" میں تھی۔

اس لئے مدن کو چاہیئے کہ پریم لتا کو بمبئی لے جائے۔

دہلی میں خوب صورت بیوی والے مرد کی ترقی کے لیے گنجائش ہی کتنی ہے؟

مدن اگر اسسٹنٹ بن بھی جاتا تو زیادہ سے زیادہ ڈھائی روپئے ملا کرتے۔ ایک سو ساٹھ کی بجائے ڈھائی سو روپے۔

یعنی محض نوّے کے پیسے وہ اپنی عزت گنوا دیتا؟ یہ تو سراسر حماقت ہوتی ہے اس لئے دوستوں نے مشورہ دیا کہ مدن کو فوراً بمبئی جانا چاہیئے۔

مگر جب مدن نے پریم لتا سے بمبئی جانے کا ذکر کیا تو وہ کسی طرح راضی نہ ہوئی۔

وہ سیدھی سادھی گھریلو لڑکی تھی۔ اسے کھانا پکانا۔ سینا پرونا۔ کپڑے دھونا۔ جھاڑو دینا اور اپنے شوہر کے لیے سوئٹر بُننا بہت پسند تھا۔ وہ چودہ روپے کی ساڑھی اور دو روپے کے بلاؤز میں بے حد خوش اور مگن تھی۔

اس نے ضد کی کہ وہ کبھی بمبئی نہیں جائے گی۔ وہ کسی سکول میں کام کر لے گی، مگر بمبئی نہیں جائے گی۔

دو تین دن تو مدن اسے سمجھاتا رہا۔ جب وہ کسی طرح نہ مانی تو وہ اسے پیٹنے لگا۔ دو دن چار چوٹ کی مار کھا کر پریم لتا سیدھی ہو گئی اور بمبئی جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

جب پریم لتا اور مدن بوری بندر کے اسٹیشن پر اترے تو ان کے پاس ایک بستر تھا دو سوٹ کیس تھے، چند سو روپے تھے

اور پریم لتا کے جہیز کا زیور تھا۔ کچھ دن وہ لوگ کالبا دیوی کی ایک دھرم شالا میں رہے اور مکان ڈھونڈتے رہے۔

جب انہیں معلوم ہوا کہ جتنے کا زیور پریم لتا کے پاس ہے، اور جتنے روپے مدن کے پاس ہیں وہ کل مل کر بھی اتنے نہیں ہو سکتے کہ بمبئی میں پگڑی دے کر ایک مکان لیا جا سکے تو وہ لوگ دھرم شالا سے گورے گاؤں کی ایک جھونپڑی میں منتقل ہو گئے۔

وہاں پہنچ کر مدن کی لڑائی جھونپڑی میں رہنے والے ایک غنڈے سے ہوئی جو شراب پی کر پریم لتا کی عزت پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔

اس لڑائی کے ایک زخم کا نشان آج بھی مدن کی کلائی پر موجود تھا۔ مگر مدن نے

بڑی بہادری اور جی داری سے لڑ کر جھونپڑیوں میں باعزّت طریقے سے رہنے کا حق منوالیا تھا۔

کیونکہ جھونپڑیوں میں رہنے والے بنیادی طور پر غریب تھے اور ایک دوسرے کے حق کو جلد تسلیم کر لیتے تھے۔

اب مدن نے پریم لتا کو ساتھ لے کر ایک سٹوڈیو سے دوسرے سٹوڈیو کے چکر لگانے شروع کر دیئے۔

دن گزر گئے۔ مہینے گزر گئے۔ چکر لگاتے لگاتے فاقے شروع ہو گئے۔ پہلے نقدی ختم ہوئی۔

پھر پریم لتا کے زیور بکے پھر قیمتی ساڑھیاں، پھر کم قیمتی ساڑھیاں۔ آخر میں مدن کے پاس صرف ایک قمیض اور پتلون رہ گئی جو اِس کے بدن پر تھی۔ اور پریم لتا کے پاس صرف ساڑھی اور بلاؤز تھا اور وہ بھی پشت سے پھٹ گیا تھا۔

"آپ کا ڈریس آیا ہے"۔

ایک اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے اندر آکر زور سے کہا اور مدن اپنے خواب سے جاگ گیا۔

اس نے دیکھا کہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے ساتھ ایک درزی ہیروئن کی نئی پوشاک لے کر آیا ہے۔

جامنی رنگ کا اطلسی غزارہ، زردوزی کے کام کا بنارسی کرتا۔ اور رُوپہلی افشاں کا دوپٹہ

سنہری گوٹے کی لہروں سے جھلمل جھلمل کرتا ہوا! لباس کے اندر آتے ہی یوں محسوس ہوا گویا میک اپ روم میں ایک فانوس روشن ہو گیا۔

میک اپ ختم کر کے ہیروئن ڈریسنگ روم میں کپڑے بدلنے کے لیے چلی گئی۔ لیڈی ہیرڈریسر اور دو خادمائیں اس کے جلو میں تھیں۔

اسے یوں جاتے دیکھ کر مدن کے ہونٹوں پر فتح یابی کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اسی دن کے لیے اس نے اتنی جد و جہد کی تھی۔ اسی دن کے لیے وہ جیا تھا۔ اسی دن کے لیے اس نے فاقے کئے تھے۔ چنے کھا کر میلی پتلون اور میلی قمیض پہن کر تپتی، دو پہروں، موسلا دھار بارش کی شاموں میں وہ پروڈیوسروں کے دفتروں اور گھروں کے چکر لگاتا رہا تھا۔

آج اس کی کامیابی کا پہلا دن تھا۔ اس کامیابی کی پہلی سیڑھی اُسے چمن بھائی نے سجھائی تھی۔

چمن بھائی فلم پروڈیوسروں کو کرایہ پر ڈریس سپلائی کیا کرتا تھا۔ اکثر اوقات وہ کسی پروڈیوسر کے دفتر میں یا کسی سٹوڈیو میں مدن کو مل جاتا تھا۔ ایک دن جب مدن اِس طرح پھٹے حالوں گھوم رہا تھا۔ چمن بھائی نے اسے اپنے پاس بلایا اور اس سے پوچھا۔

”کہیں کام بنا؟“

”نہیں“

”تم نرے گدھے ہو“

اب مدن نے گالی سن کر بھی خاموش رہنا سیکھ لیا تھا۔ اسی لیے وہ خاموش رہا۔

دیر تک چمن بھائی بڑے غصّے میں اس کی طرف دیکھ کر گھورتا رہا۔ آخر بولا: ”آج شام کو میں تمہارے گھر آؤں گا اور تمہیں کچھ گُر کی باتیں بتاؤں گا“

پریم لتا نے اپنی پھٹی ساڑھی کے پھٹے ہوئے آنچل سے اپنی جوانی کو ڈھانپنے کی ناکام کوشش

کی۔ پھر اس نے بیزار ہو کر منہ پھیر لیا۔ جہاں جاؤ کوئی نہ کوئی ملک گردھاری لال مل جاتا ہے۔

مگر اس شام کو چمن بھائی نے ان کے جھونپڑے میں بیٹھ کر کاجو پیتے ہوئے کوئی نامناسب حرکت نہیں کی۔ البتہ پانچویں پیگ کے بعد ایک دم بھڑک کر بولا۔ جب تک پریم لتا تمہاری بیوی رہے گی یہ کبھی ہیروئن نہیں بن سکتی۔"

"کیا بکتے ہو؟" مدن غصے سے چلّا کر بولا۔

"ٹھیک بکتا ہوں۔" چمن بھائی ہاتھ چلا کر زوردار لہجہ میں بولا۔

"سالا ہلکٹ کس کو تمہاری بیوی دیکھنے کی چاہت ہے۔ سب لوگ مل مجور سے لے کر مل مالک تک فلم کی ہیروئن کو کنواری دیکھنا چاہتا ہے۔"

"کنواری؟"

"ایک دم ورجن!"

"مگر میری بیوی کنواری کیسے ہو سکتی ہے؟ وہ تو شادی شدہ ہے۔"

"تو اس کو شادی والی رٹ بولو۔ کنواری بولو۔ اپنی بیوی مت بولو۔ بولو یہ لڑکی میری بہن۔"

"میری بہن؟" مدن نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ہاں تمہاری بہن.......... ارے بابا۔ کون تمہاری جھونپڑی میں دیکھنے آتا ہے کہ یہ تمہاری بہن ہے کہ بیوی ہے۔ مگر دنیا کو بولو کہ یہ تمہاری بہن ہے۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے؟"

چمن بھائی تو یہ گُر بتا کر چلا گیا۔ مگر پریم لتا نہیں مانی۔ مدن کے بار بار سمجھانے پر بھی نہیں

مانی۔

" میں اپنے شوہر کو اپنا سگا بھائی بتاؤں گی ؟ ہرگز نہیں ۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا ! اس سے پہلے میں مر جاؤں گی ۔ تم میری زبان گدّی سے باہر کھینچ لوگے ۔ جب بھی اپنے پتی کو اپنا بھائی نہیں کہوں گی ۔"

آخر مدن کو پھر اُسے پیٹنا پڑا ۔ دو دن پریم لتا نے چار چوٹ کی مار کھائی تو سیدھی ہو گئی اور فلم پروڈیوسروں کے دفتر میں جا کر اپنے شوہر کو اپنا بھائی بتانے لگی ۔

چمن بھائی نے مدن کو اپنے ایک دوست پروڈیوسر چھگن بھائی سے ملوا دیا ۔ چھگن بھائی نے پریم لتا کے فوٹو ایک کمرشل سٹوڈیو سے نکلوائے اور اپنے ڈائریکٹر مرزا عزت بیگ کو بلوا کر پریم لتا سے اس کا تعارف کرایا ۔ مرزا عزت بیگ نے بڑی گہری نظروں سے پریم لتا کو دیکھا ۔ اس سے بات چیت کی ۔ پھر سکرین ٹیسٹ کے لیے ہاں کر دی ۔

سکرین ٹیسٹ کے لیے فلم کا ایک سین پریم لتا کو یاد کرنے کے لیے دیا گیا ۔ تین دن کے بعد سکرین ٹیسٹ رکھا گیا تو تینوں دن ہر روز شام کے وقت چمن بھائی جھونپڑے میں مدن اور پریم لتا سے ملنے کے لیے آتا رہا ۔ اور کاجو پیتا رہا ۔ اور ان دونوں کا حوصلہ بڑھاتا رہا ۔

تیسرے دن چمن بھائی نے مدن سے کہا " آج سکرین ٹیسٹ ہے میری مانو تو تم آج پریم لتا کے ساتھ نہ جاؤ ۔"

" کیوں نہ جاؤں ؟"

" اس لئے اگر تم ساتھ گئے تو پریم لتا فری ایکٹنگ نہ کر سکے گی ۔ تمہیں دیکھ کر شرما

جائے گی اور گھبرا جائے گی اور اگر پریم لتا گھبرا گئی تو سکرین ٹیسٹ میں فیل ہو جائے گی۔"

"کیسے فیل ہو جائے گی؟" مدن شراب کے نشے میں جھلا کر بولا۔

"میری بیوی نسیم، سچترا سین، مدھو بالا سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ میری بیوی الزبتھ ٹیلر سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ میری بیوی نرگس سے بہتر اداکارہ ہے۔ میری بیوی کسی سکرین ٹیسٹ میں فیل نہیں ہو سکتی میری بیوی۔"

"ابے سالے۔ بیوی نہیں، بہن بول بہن!" چمن بھائی نے ہاتھ چلاتے ہوئے زور سے کہا۔

"اچھا بہن ہی سہی۔" مدن شراب کے جام خالی کرتے ہوئے بولا "جیسا تم بولو گے چمن بھائی، ایسا ہی میں کروں گا۔ آج تک تمہاری کوئی بات ٹالی ہے۔ جواب ٹالوں گا۔ لے جاؤ۔ میرے بھائی، اپنی بہن کو تم، آج سکرین ٹیسٹ کے لیے جاؤ۔ مگر حفاظت سے واپس پہنچا دینا۔"

"دکھا طری رکھو۔" چمن بولا "اپنی گاڑی میں لے کر جا رہا ہوں۔ اپنی گاڑی میں لے کر آؤں گا۔"

بہت رات گئے پریم لتا سکرین ٹیسٹ سے پروڈیوسر کی گاڑی میں لوٹی۔ اس نے وہی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ جو سکرین ٹیسٹ کے لیے استعمال کی گئی تھی۔ اور اس کے منہ سے شراب کی بُو آ رہی تھی۔

مدن غصے سے پاگل ہو گیا "تم نے شراب پی؟"

"ہاں! سین میں ایسا ہی کرنا تھا۔"

"مگر پہلے سین میں، جو تمہیں دیا گیا تھا، اس میں تو ایسا نہیں تھا"

"مرزا عزت بیگ نے سین بدل دیا تھا"

"تو تم نے شراب پی۔ صرف شراب پی؟ مدن نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں صرف شراب پی"

"اور تو کچھ نہیں ہوا؟"

"نہیں" پریم لتا بولی۔ البتہ سین کی ریہرسل الگ سے کراتے ہوئے مرزا عزت بیگ نے میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

"کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ کیوں؟" مدن نے پھر بھڑک کر کہا۔

"سین کا ایکشن سمجھانے کی خاطر" پریم لتا بولی۔

مدن کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ آہستہ سے بولا "صرف کمر میں ہاتھ ڈالا، عزت پر ہاتھ تو نہیں ڈالا؟"

"نہیں" پریم لتا نے نظریں چرا کر کہا۔

"صاف بتاؤ اور تو کچھ نہیں ہوا؟"

"ہاں ہوا تھا" پریم لتا جھجکتے جھجکتے بولی۔

"کیا ہوا تھا؟" مدن پھر بھڑکنے لگا۔

"سکرین ٹیسٹ کے دوران میں وہ، جو میرے سامنے ہیرو کا کام کر رہا تھا اس نے مجھے زور سے اپنی باہوں میں بھینچ لیا"

"ایسا اُس بدمعاش نے کیوں کیا؟" مدن گرج کر بولا۔

"سین ہی ایسا تھا" پریم لتا بولی۔

"اچھا سین ہی ایسا تھا" مدن اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے بولا "جب سین ہی ایسا تھا تو کوئی مضائقہ نہ تھا ——— مگر ٹھیک ٹھیک بتاؤ صرف باہنوں میں لے کر بھینچا تھا؟"

"ہاں صرف باہنوں میں لے کر بھینچا تھا۔ پریم لتا گلوگیر لہجے میں بولی پھر یکایک بستر پر گر کر تکیہ میں سر چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"شارٹ تیار ہے"

یہ پروڈیوسر چھگن بھائی کی آواز تھی۔ مدن اس آواز کو سن کر چونک گیا۔ اور بے اختیار کرسی سے اٹھ گیا۔ چھگن بھائی مدن کو دیکھ کر مسکرایا۔ ہاتھ بڑھا کر اُس نے مدن سے مصافحہ کیا۔ بڑے پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس سے پوچھا "سروج بالا کدھر ہے؟" چھگن بھائی نے اپنی نئی ہیروئن کا نام پریم لتا سے بدل کر سروج بالا رکھ دیا تھا۔ بیشتر اس کے مدن کوئی جواب دے۔ نئی ہیروئن خود ڈریسنگ روم سے نکل کر خراماں خراماں میک اپ روم میں چلی گئی۔ اور نئے لباس، نئے ہیر سٹائل اور مکمل میک اپ کے ساتھ قدم قدم پر ایک نیا فتنہ جگاتی ہوئی آئی۔

چند لمحوں تک تو مدن بالکل مبہوت کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ گویا اُسے یقین نہ ہو کہ یہ عورت اس کی بیوی پریم لتا ہے۔ چھگن بھائی بھی ایک لمحے کے لئے بھونچکا رہ گیا۔ اور اس ایک لمحے میں اسے مکمل اطمینان ہو گیا کہ اس نے جو فیصلہ کیا تھا وہ بالکل ٹھیک تھا۔

دوسرے لمحے میں چھگن بھائی نے تھیٹریکل انداز میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور بلند آواز میں کہنے لگا: "شارٹ تیار ہے سرکار والی سیٹ پر تشریف لے چلیئے"۔

نئی ہیروئن کھلکھلا کر ہنس پڑی اور مدن کو ایسے لگا جیسے کسی شاہی ہال میں لٹکے ہوئے استنبولی فانوس کی بہت سی بلوریں قلمیں ایک ساتھ بج اٹھیں، نئی ہیروئن مسکراہٹ کے موتی بکھیرتی ہوئی چھگن بھائی کے ساتھ سیٹ پر چلی۔

مدن بھی پیچھے پیچھے چلا اور چھگن بھائی تو اپنی بیوی کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھ کر مدن کو وہ دن یاد آگیا جب چھگن بھائی نے سکرین ٹیسٹ کے چند دن بعد مدن کو اپنے دفتر بلا بھیجا تھا۔

مدن کی کمر میں ہاتھ ڈال کر چھگن خود اُسے اندر کمرے میں لے گیا تھا۔ جو ائیرکنڈیشنڈ تھا اور چھگن کا خاص اپنا پرائیویٹ کمرہ تھا۔ بزنس کے تمام اہم امور اسی میں طے ہوتے تھے۔ جب مدن اس کمرے کے اندر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس سے پہلے اس کمرے میں مرزا عزت بیگ اور چمن بھائی آئے ہوئے بیٹھے ہیں۔

"آج بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ ہے"۔ چمن بھائی نے ہنس کر کہا۔

"آج ہم لوگ ایک سونے کی کان خریدنے والے ہیں"۔

"سونے کی کان ؟"

مدن نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں اور تمہارا بھی اس میں حصہ ہے ———— ایک چوتھائی کا اور تین تمہارے پارٹنر تمہارے سامنے اس کمرے میں بیٹھے ہیں۔ میں

چھگن بھائی، یہ میرا دوست چمن بھائی، یہ میرا ڈائریکٹر مرزا عزت بیگ ہم چاروں آنج سے اس سونے کی کان کے پارٹنر ہوں گے۔

"اور یہ سونے کی کان ہے کہاں؟"

چھگن بھائی نے جواب میں میز سے ایک تصویر اٹھائی اور مدن کو دکھاتے ہوئے بولا "یہ رہی"۔

یہ پریم لتا کی تصویر تھی۔

مدن نے حیرت سے کہا" مگر یہ تو میری بی —————— میرا مطلب ہے میری بہن کی تصویر ہے"۔

"یہی تو سونے کی کان ہے۔ تمہاری بہن کو اپنی نئی پکچر میں ہیروئن لے رہا ہوں اور انڈسٹری کے ٹاپ ہیرو کے سنگ۔ دیوراج کے سنگ جس کی کوئی تصویر سلور جوبلی سے ادھر اترتی ہی نہیں۔ بولو؟ پھر ایک پکچر کے بعد اس ہیروئن کی قیمت ڈھائی لاکھ ہوگی کہ نہیں؟ بولو؟ اس کو میں سونے کی کان بولتا ہوں تو کیا غلط بولتا ہوں؟ جواب دو"۔

"مگر میں پوچھتا ہوں۔ میری سونے کی کان آپ کی کیسے ہوگئی؟" مدن نے حیران ہوکر پوچھا۔

"کیوں کہ میں اسے ہیروئن لے رہا ہوں"۔ چھگن بلند آواز میں بولا۔

"یوں تو یہ لڑکی کیا ہے؟ گورے گاؤں کے ایک جھونپڑے میں رہنے والی، پندرہ روپے کی چھوکری!"

پھر میں اس کی پبلسٹی پر بہتر ہزار روپیہ خرچ کروں گا کہ نہیں؟ پھر میں اس کو

ٹاپ کے ہیرو دیو راج کے سنگ ڈال رہا ہوں کہ نہیں ؟ اس کے بعد اگر میں اس کان میں آدھوں آدھ شیئر مانگتا ہوں تو کیا زیادہ مانگتا ہوں ؟ اور وہ بھی صرف پانچ سال کے لیے۔"

"اور تم ؟" مدن نے چمن بھائی سے پوچھا۔

"اگر میں تمہیں جھگن بھائی سے نہ ملاتا تو تمہیں یہ کانٹریکٹ آج کہاں سے ملتا اس لئے حساب سے ساڑھے بارہ فیصدی کا کمیشن میرا ہے۔"

"اور تم ؟" مدن مرزا عزت بیگ کی طرف مڑ کر بولا۔

"اپن تو ڈائریکٹر ہے۔" مرزا عزت بیگ بولا "اپن چاہے تو اس پکچر میں نئی ہیروئن کو فرسٹ کلاس بنا دے۔ چاہے تو تھرڈ کلاس بنا دے۔ اس لئے اپن کو بھی ساڑھے بارہ فیصد چاہیئے۔"

"مگر یہ تو بلیک میل ہے۔" یکایک مدن بھڑک کر بولا۔

"عزت کی بات کرو۔ عزت کی۔" عزت بیگ خفا ہو کر بولا۔ "اپن اپنی عزت ہمیشہ بیگ میں رکھتا ہے۔ اس لئے اپن کا نام عزت بیگ ہے۔ اپن عزت چاہتا ہے اور اپنا شیئر صرف ساڑھے بارہ فیصدی!"

یکایک مدن کو ایسا محسوس ہوا جیسے پریم لتا کوئی عورت نہیں ہے، وہ ایک کاروباری تجارتی ادارہ ہے جس کے شیئر بمبئی کے سٹاک ایکسچینج پر خرید و فروخت کے لیے آ گئے ہیں۔ جیسے گلوب کمبائن، الکائن اور ٹاٹا ڈلیفرڈ۔ ایسے ہی پریم لتا پرائیویٹ لمیٹڈ...

"مجھے کہاں دستخط کرنے ہوں گے ؟" مدن نے تقریباً روہانسا ہو کر پوچھا۔

.... فاقوں کے ماہ و سال ماضی کا حصّہ بن چکے تھے۔ جس دن مدن

نے کانٹریکٹ پر دستخط کئے۔ جھگن نے اُسے دو ہزار کا چیک دیا۔ مالابار ہل پر اُن کے رہنے کے لیے ایک عمدہ فلیٹ ٹھیک کرادیا۔ ایک نئی فیاٹ گلوب موٹرز کی دُکان سے نکلوا کے دیدی۔

اسی رات مدن اور پریم لتا اپنے نئے فلیٹ میں چلے گئے اور مدن نے پریم لتا کو گلے سے لگا کر اس کی کامیابی کے لئے دُعا کی اور مدن کے پیروں کو چھو کر پریم لتا نے پرتگیا کی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے صرف اس کی ہو کے رہے گی۔

آخر کار مدن کی محنت اور جد و جہد رنگ لائی۔ آخر کار کامیابی نے مدن کے پیر چومے۔ آج اس کی بیوی ہیروئن تھی۔ پریم لتا سروج بالا تھی اور آج اس کی شوٹنگ کا پہلا دن تھا۔

اور اب وہ دن بھی ختم ہو رہا تھا۔ سٹیج نمبر ایک کے باہر مدن اپنی فیاٹ میں بیٹھا ہوا بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ کب پانچ بجیں گے کب پیک اپ ہوگا اور کب وہ اپنی دل کی رانی کو اپنی فیاٹ میں بٹھا کر دور کہیں سمندر کے کنارے ڈرائیو کے لئے لے جائے گا۔

میک اپ کی گھنٹی بجی۔ مدن کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد نئی ہیروئن باہر نکلی۔ اس کا ہاتھ ہیرو کے ہاتھ میں تھا اور وہ دونوں بڑی بے تکلفی سے باتیں کرتے، ہنستے بولتے، ہاتھ جھلاتے ساتھ ساتھ چلے آرہے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ فیاٹ سے آگے چلے گئے۔ جہاں ہیرو کی شاندار امپالا گاڑی کھڑی تھی۔

مدن نے فیاٹ کا پٹ کھول کر آواز دی۔

"سروج"

"ہاں بھیا! ہیروئن پلٹ کر چلائی اور پھر دوڑتی ہوئی مدن کے پاس آئی اور آہستہ سے بولی: "تم گھر جاؤ۔ میں دیوراج کی گاڑی میں آتی ہوں"۔

"مگر تم میری گاڑی میں کیوں نہیں جا سکتیں؟" مدن نے غصے سے پوچھا۔

"باولے ہو گئے ہو!" پریم لتا نے طیش کھا کر جواب دیا۔

"میں اب ایک ہیروئن ہوں، اب میں کیسے تمہارے ساتھ چھوٹی سی فیاٹ میں بیٹھ کر سٹوڈیو سے نکل سکتی ہوں لوگ مجھے کیا کہیں گے؟

"سروج!" ہیرو زور سے چلآیا۔

"آئی"۔ سروج بھی زور سے چلآئی، اور پلٹ کے ہیرو کی گاڑی کی طرف دوڑتی ہوئی چلی گئی۔ دیوراج سامنے کی سیٹ پر ڈرائیو کرنے کے لیے بیٹھ گیا اور سروج اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ پھر امپالا کے پٹ بند ہو گئے اور وہ خوب صورت زمردی گاڑی ایک خوش آہنگ ہارن کی موسیقی پیدا کرتی ہوئی گیٹ سے باہر چلی گئی اور مدن کی فیاٹ کا پٹ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

سپیرن

۱

ایک روز میں اپنی ماں کے کمرے میں اپنی گیند لینے جا رہا تھا کہ میں نے دروازے کی اوٹ میں سے اپنی ماں کو یہ کہتے سُنا۔

"ہٹو، مجھے مت چھوؤ۔" ماں کہہ رہی تھیں۔

"کیوں نہ چھوؤں؟" یہ میرے پتاجی کی آواز تھی۔

"آج سنکرانت ہے۔"

"سنکرانت ہے تو کیا ہوا؟"

"سنکرانت میں نہیں چھوتے۔" ماں جی بولیں۔

"تو کل؟" میرے پتاجی نے پوچھا۔

"کل — ؟ کل تو بامن اوتار کا دن ہے۔"

"اچھا تو پرسوں؟"

"لوں؟ —— پرسوں شاہ مراد کی نیاز کا دن ہے۔ بھول گئے نیاز دینے کے لیے تمہیں بھی مزار پر چلنا ہوگا۔ میاں رمضانی کہہ رہے تھے ڈاکٹر صاحب کبھی مزار پر نہیں آتے؟ کیوں؟ —— اے ہٹو —— ہٹو —— کہے دیتی ہوں مجھے ہاتھ لگایا تو دوبارہ اشنان کرنا پڑے گا۔"

تھوڑی دیر کے بعد پتا جی کمرے سے باہر نکلے، مگر بے حد جھنجھنائے ہوئے اور جھلائے ہوئے۔ اچھا ہوا میں دروازے کی اوٹ میں تھا۔ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا ورنہ مجھ پر ضرور خفا ہوتے۔

ماں جی اور پتا جی ضرور اس بات پر خفا ہوتے ہیں کہ بچوں کو بڑوں کی باتیں نہیں سننا چاہیئے یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی بڑے تو ہماری ہر بات سُن لیتے ہیں۔

ذرا ذرا سی بات اس قدر کرید کرید کر پوچھتے ہیں اور ہم جو کہیں سے دو باتیں سن پائیں تو مار کھائیں۔ پتا جی کے جانے کے بعد میں دوڑتا ہوا ماں کے کمرے میں گھس گیا اور جاتے ہی ان کی ٹانگوں سے لپٹ کر کہنے لگا۔

"آہا جی۔ میں نے چھو لیا! چھو لیا!! چھو لیا!!!"

میں نے سوچا تھا۔ ماں جی خفا ہوں گی۔ جھلائیں گی۔ اونچا بولیں گی۔ مگر وہ کچھ نہ بولیں۔ وہ اپنی کپڑا سینے کی مشین پر غلاف چڑھا رہی تھیں۔ مجھے اپنی ٹانگوں سے لپٹتے دیکھ کر مسکرائیں۔ جھک کر انہوں نے مجھے اپنی گود میں اٹھا لیا اور پیار کرتے ہوئے بولیں۔

"کاکا! تو نے ناشتہ کر لیا؟"

"ہاں، ماں!"

"اور لال شربت پی لیا؟"

"ہاں، ماں!"

ماں نے مجھے دونوں گالوں پر چوما۔ پھر گود سے اتار کر بولیں۔

"تو جاؤ اب باہر باغ میں کھیلو۔"

ماں جی اس وقت مجھے خوش نظر آتی تھیں۔ میں نے سوچا۔ یہ موقع اچھا ہے چنانچہ میں نے پوچھ لیا۔

"ماں جی! ایک بات بتاؤں؟"

"ہاں۔"

میں نے تمہیں چھوا۔ تو تم کچھ نہ بولیں۔ ابھی پتا جی تمہیں چھونے کو کہہ رہے تھے تو تم ہٹو، ہٹو کیوں کہہ رہی تھیں؟"

ماں جی کا مسکراتا ہوا چہرہ ایک دم غصے سے لال ہو گیا۔ وہ کھڑی تھیں۔ یکایک ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے مجھے دونوں بانہوں سے پکڑ لیا اور مجھے زور زور سے ہلاتے ہوئے بولیں۔

"تم ہماری باتیں سنتے رہے تھے بدمعاش؟"

میں سہم گیا۔ مگر ماں جی مجھے برابر غصے سے ہلا رہی تھیں۔ جس طرح پتا جی دوا پلاتے وقت دوا کی شیشی زور زور سے ہلاتے ہیں۔ میں نے کانپ کر اقبال کر لیا۔

"ہاں میں دروازے کی اوٹ میں تھا مگر میں نے سنا نہیں ماں، وہ تو خود میرے

کانوں میں پڑ گیا۔ میں تو اپنی گیند لینے......"

مگر ماں نے آگے کا فقرہ مکمل ہونے نہیں دیا۔ تڑاخ تڑاخ دو تین چار طمانچے میرے رخساروں پہ پڑے۔ "تجھے دس بار کہا ہے۔ بڑوں کی باتیں مت سنو! مت سنو!! مت سنو!!! تو پھر بھی نہیں مانتا ہے ایں؟!! ایک طمانچہ ایں! دوسرا طمانچہ، ایں؟ تیسرا طمانچہ، ڈھیٹ سور......

نہ جانے مجھے ابھی کتنے طمانچے پڑتے اگر اسی وقت کمرے صاف کرنے والی ملازمہ بیگم بھاگی بھاگی اندر نہ آتی۔ اس نے دوڑ کر زبردستی مجھے ماں سے چھین لیا اور بولی: "اب کیا اسے مار ہی ڈالو گی؟ تمہارا غصہ تو اندھے کا غصہ ہے مالکن۔ مارتے وقت آگا پیچھا کچھ نہیں دیکھتی ہو؟"

بیگم نے میرے آنسو پونچھے۔ میرا منہ دھویا۔ میرا منہ چوما۔ مجھے اپنے گدگدے سینے سے لگایا اور جب میری سسکیاں بند ہو گئیں۔ تو وہ مجھے بنگلے کے پچھواڑے کی طرف لے گئی۔ جہاں پالتو کبوتروں کی چھتری تھی۔ بیگم نے ایک کبوتر پکڑ کر میرے ہاتھ میں دیا۔ اور بولی۔ لو اب اس سے کھیلو۔

یہ کہہ کر وہ مجھے پچھواڑے چھوڑ کر کام کے لیے اندر چلی گئی۔

میں کچھ دیر تک تو کبوتروں سے کھیلتا رہا۔ پھر بلی کے بچوں سے کھیلتا رہا۔ مجھے معلوم نہیں میں کب تک کھیلتا رہا۔

یکایک میں نے محسوس کیا۔ جیسے بنگلے سے باہر لکڑی کے جنگلے سے پرے دو بڑی بڑی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں میں نے سر اٹھا کے اچھی طرح دیکھا۔

وہ بڑی خوب صورت تھی۔ اس کا رنگ تانبے کا سا تھا۔ آنکھیں گہری تھی۔ اور

بال اُلجھے اُلجھے سے تھے۔ اس نے لال سوسی کی ایک تنگ قمیض پہن رکھی تھی۔ جس سے اس کا سینہ اُبھر آیا تھا۔ اور اس کے سینے پر چاندی کی زنجیریں اور رنگ برنگے منکوں کی مالائیں پڑی تھیں۔ اس کے کانوں میں چاندی کی بڑی بڑی بالیاں تھیں۔ وہ جب ہنستی تو وہ بڑے مزے سے جھولتی تھیں اور کبھی کبھی اس کے رخساروں سے بھی لگ جاتیں۔ کیوں کہ وہ بالیاں بہت ہی بڑی تھیں اور جب وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور ہنسی تو مجھے اس کے دانت شہتوتی کی طرح بالکل چھوٹے چھوٹے اور بے انتہا سفید معلوم ہوئے۔

ایسے سفید دانت میرے بھی نہیں ہیں۔ حالانکہ ماں جی دن میں دو بار برش کرواتی ہیں!

لال سوسی کی قمیض کے نیچے اس نے گھیرے دار لہنگا پہن رکھا تھا۔ جس پر کئی رنگ .... اور کئی طرح کا کپڑا لگا ہوا تھا اور کئی کئی جگہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی سلے ہوتے تھے مگر اس کے پاؤں ننگے تھے اس کے پاؤں میں جوتا نہیں تھا اور اس نے اپنے کندھے پر دو ٹوکریاں لٹکا رکھی تھی۔

جب وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی تو میں نے اس سے پوچھا۔

"تم کون؟"

جنگلے کے باہر کھڑے کھڑے اس نے اپنے بائیں پاؤں سے اپنا دائیاں پاؤں کھجایا بولی۔

"میں سپیرن ہوں۔ میرے پاس عمدہ عمدہ سانپ ہیں۔ دیکھو گے؟"

"ہاں دیکھوں گا" میں نے خوش ہو کر کہا۔

پھر فوراً ہی مایوس ہو کر بولا۔

"مگر تمہارے پاس تو بین بھی نہیں ہے۔"

"ہے کیوں نہیں ہے؟" سپیرن اپنا کندھا جھٹک کر بولی۔ اور پیٹھ پر لٹکی ہوئی بین سامنے آگئی۔

"یہ دیکھو۔"

میں نے خوشی سے دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجا کر کہا۔

"پہلے تم مجھے بین بجا کر دکھاؤ۔"

وہ بولی۔

"نہیں، پہلے تم مجھے ایک آنہ دو!"

میرا دل ایک دم سے بیٹھ سے گیا۔

"ایک آنہ تو میرے پاس نہیں ہے!" میں نے بالکل مایوس ہو کر کہا۔

"تو اپنی ماں سے مانگ لاؤ۔"

"وہ نہیں دیں گی۔ وہ مجھے سانپ بھی نہیں دیکھنے دیں گی۔ انہیں سانپوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"اپنے باپ سے مانگ لاؤ!"

سپیرن نے مجھے سمجھایا۔

"ہاں یہ ہو سکتا ہے۔" یکایک میرا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ اور میں چھلانگ مار کر لکڑی کے جنگلے سے کود کر سپیرن کے پاس چلا گیا۔

"چلو، میں تمہیں پتا جی سے ایک آنہ لے کے دیتا ہوں۔"

میں باغ کی روشوں پر دوڑتا ہوا سپیرن کے آگے آگے چلا جا رہا تھا۔ راستے

میں مجھے پتاجی مل گئے جو ہسپتال سے واپس آ رہے تھے۔ اور مویشی خانے کے قریب کھڑے ہو کر مالی سے بات کر رہے تھے۔ جو سونف کی جھاڑیوں کے ایک بہت بڑے جھنڈ کے قریب بیٹھا ہوا اپنی کھرپی چلا رہا تھا۔ سونف کا جھنڈ قد میں مجھ سے دگنا ہو گا پتاجی اس جھنڈ کے دوسری طرف تھے۔ اور ہم لوگ اس طرف تھے۔ اس لئے پتاجی نے مجھے آتے ہوئے نہ دیکھا۔

میں بھی صرف ان کے سینے سے اوپر کا حصہ دیکھ سکتا تھا۔ اور وہ بھی مجھے نہ دیکھ سکتے تھے۔ انہوں نے صرف اتنا دیکھا کہ اُلجھے اُلجھے سیاہ بالوں کے ہالے میں گہری سبز آنکھوں والا ایک چہرہ سونف کی مہکتی ہوئی پھننگوں پر بہتا ہوا اُن کے سامنے چلا آ رہا تھا۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے بولے۔

"تم کون ہو؟"

"میں سپیرن ہوں۔"

"یہ کام تو مردوں کا ہے!"

"میرا باپ سپیرا تھا۔ جب وہ مر گیا تو میں نے یہ کام سنبھال لیا۔"

"کیوں، تمہارا کوئی بھائی نہیں؟"

"نہیں صرف ایک اندھی ماں ہے اور وہ بھی بوڑھی ہے۔"

وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔ سپیرن شاید مجھے بھول بھی چکی تھی۔ شروع میں میرا ارادہ دخل دینے کا تھا اور چیخ کر اپنی موجودگی جتانے کا بھی تھا۔ مگر جب دو بڑوں میں گفتگو شروع ہو جائے تو اس میں بچوں کو دخل دینا اچھا نہیں ہوتا۔ اور ابھی ابھی میں اپنی ماں سے پٹ بھی چکا تھا۔ مگر ان لوگوں کی

باتیں ہوتی ہیں دلچسپ!

تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد میرے پتاجی بولے۔

"تم سانپ پکڑ سکتی ہو؟"

سپیرن نے بے خوف نگاہوں سے انہیں تاکتے ہوئے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا۔!

"ناگ بھی؟" پتاجی شریر نگاہوں سے اُسے تاکتے ہوئے بولے۔

سپیرن مسکرائی۔ ہنس کر بولی "بڑے سے بڑا ناگ بھی میری بین کی آواز سُن کر چھپا نہیں رہ سکتا۔ مست ہو کر میری بین پر جھومنے لگے گا۔!"

"ہمارے باغ میں بہت سے سانپ رہتے ہیں۔ کیا تم سب پکڑ لوگی؟"

"سب پکڑ لوں گی۔ مگر تم دو گے کیا؟"

پتاجی خاموش کھڑے رہے۔ دیر تک اسے دیکھتے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے۔

"اور اگر میں تمہیں کچھ نہ دوں تو؟"

سپیرن نے دیر تک میرے پتاجی کی طرف دیکھا۔ اور ان کے بالکل قریب آگئی اس کی سانس زور زور سے چل رہی تھی۔

اس نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر میرے والد کی بڑی بڑی بے خوف آنکھوں، مضبوط اور وجیہہ جسم کو دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ یکایک اس نے آنکھیں نیچے جھکالیں۔ آہستہ سے کمزور آواز میں بولی۔

"اچھا۔"

جس طرح سے اس نے اچھا کہا۔ وہ مجھے بہت بُرا معلوم ہوا۔ جیسے اس کی آواز رو رہی

ہو۔ اور کراہ رہی ہو۔ جیسے دور سے باغ میں کوئی ان جانی ہوا آئی تھی اور سسکیاں لے کر چلی گئی۔

کبھی کبھی دوپہر میں ہمارے باغ میں بالکل اسی طرح ہوا روتی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے مالی سے کئی بار اس کی وجہ پوچھی ہے۔ مگر وہ ہمیشہ مجھے ہنس کر ٹال دیتا ہے کہتا ہے۔

"یہ تمہارا وہم ہے کاکا! ہوا تو بس ہوا ہے۔ وہ نہ روتی ہے نہ گاتی ہے۔ وہ تو بس درختوں کے پتوں کو چھیڑتی ہوئی گزر جاتی ہے۔"

مگر اس وقت ہوا نہ جانے کس کو چھیڑ رہا ہے۔

میرے پتا بولے "تم کہاں رہتی ہو؟"

"آج ہی تو یہاں آئی ہوں۔ ابھی رہنے کا ٹھکانا کہیں نہیں بنایا۔ ویسے اپنی ماں کے ساتھ بالے پور کے گاؤں میں رہتی ہوں۔"

"تم اکیلی گھومتی ہو۔ تمہیں مردوں سے ڈر نہیں لگتا۔؟"

سپیرن بولی "میرے سانپ میری حفاظت کرتے ہیں۔ مجھے تو نہیں البتہ مردوں کو مجھ سے ڈر لگتا ہے!"

"ہمارے باغ میں ایک ناگ ہے۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔" میرے باپ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"کہاں رہتا ہے وہ؟ مجھے اس کا بل بتا دو۔ یا رہنے کی ڈھا دو۔ میں اسے پکڑ لوں گی۔ میری بین میں ایسا جادو ہے۔ جس سے بڑے سے بڑا ناگ بھی نہیں بچ سکتا۔"

میرے پتاجی بولے "میں مالی سے کہہ دیتا ہوں وہ تمہیں اپنے گھر رکھ لے گا اور جب تک تم ہمارے باغ کے سانپ پکڑو گی۔ اس کے گھر میں رہو گی اور میں تمہیں ایک سانپ پکڑنے پر ایک اٹھنی دیا کروں گا۔ مگر خبردار تم ہمارے باغ کے ناگ کے بل پر مت جانا۔ اس کے کاٹے کا منتر نہیں ہے۔"

"جاؤ جاؤ!"

سپیرن اپنی چھوٹی سی زبان نکال کر میرے باپ کو چڑاتے ہوئے بولی۔ پھر اس نے اپنی بین اس کے سامنے جھلائی اور بولی۔

"بتاؤ تو سہی کدھر ہے وہ تمہارا ناگ؟"

"چلو۔ تمہیں دکھاؤں۔"

پتاجی کو تو خیر معلوم نہ تھا۔ میں سونف کے جھنڈ کے اس طرف سپیرن کے اس قدر قریب کھڑا ہوں۔ مگر سپیرن کیوں مجھے بھول گئی تھی۔

وہ میری طرف سے بالکل انجان ہو کر میرے پتاجی کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ میں بھی ذرا کچھ فاصلہ رکھ کر ان کے پیچھے پیچھے پیڑوں کی اوٹ میں چلنے لگا۔

چیری کے درختوں سے گزر کر وہ لوگ آڑوؤں کے جھنڈ میں پہنچے۔ وہاں سے گزر کر اخروٹ کے درختوں کے قریب ایک چھوٹے سے ٹیلے پر جا کے رُک گئے۔

میرے پتا بولے "وہ ناگ یہاں رہتا ہے۔"

"اس ٹیلے کے اندر؟"

"ہاں۔ کہتے ہیں اس ٹیلے کے اندر سیداں بی کی قبر ہے۔"

"سیداں بی کون تھی؟"

"یہ تو کوئی بھی نہیں جانتا۔ سیداں بی کون تھی۔ مگر لوگ کہتے ہیں وہ بڑی خوبصورت تھی۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب یہاں پر نہ یہ باغ تھا۔ نہ ہسپتال تھا۔ نہ راجہ جی کا محل تھا۔ ان دنوں مغل شہزادے کا ایک قافلہ اُدھر سے گزرا تھا۔ اور سیداں بی اس مغل شہزادے پر عاشق ہو گئی تھی۔ وہ مغل شہزادہ اپنے باپ سے بھاگ کر یہاں آیا تھا اور چھ ماہ سیداں بی کے گھر رہا تھا۔"

"پھر۔۔؟"

"چھ ماہ کے بعد مغل شہزادے کو شاہی دربار سے پیام آیا۔ اُس کے باپ نے اُسے معاف کر دیا تھا اور اب وہ اُسے واپس بُلا رہا تھا۔"

"پھر؟"

"پھر مغل شہزادہ چلا گیا۔ اور سیداں بی سے کہہ گیا کہ وہ اُسے شاہی دربار سے بُلا بھیجے گا۔ سیداں بی زندگی بھر مغل شہزادے کے بُلاوے کا انتظار کرتی رہی۔۔۔۔ یہاں وہ دفن ہے۔"

سپیرن کچھ نہ بولی۔

وہ جھجک کر اور ۔۔ پاؤں پسار کر ٹیلے کے قریب بیٹھ گئی۔ اُس نے پٹاریاں کندھے سے اُتار کر الگ رکھ دیں۔ آنکھیں بند کر کے بین بجانے لگی۔

سچ مچ اس کی بین کی آواز بڑی من موہنی تھی۔ جیسے وہ بین رو رو کر پکار رہی ہو۔ کسی کو بلا رہی ہو۔ جیسے وہ بین زخمی ہو اور مرہم چاہتی ہو۔ جیسے وہ ایک بھولا بھٹکا ہوا بچہ ہو اور راستہ پوچھتی ہو۔ کدھر؟ کدھر؟

وہ دیر تک بین بجاتی رہی۔ مگر میں نے نہ دیکھا۔ اس کے بین بجانے سے کوئی

ناگ ٹیلے سے باہر نکلا۔ ہاں میرے باپ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

کچھ دیر کے بعد میرے پتا اور سپیرن دونوں مالی کے گھر کی طرف چل دیئے اور میں اپنے گھر آ گیا۔

"اُدھر مالی کے گھر میں ایک سپیرن آئی ہے!" میں نے اپنی ماں سے کہا۔

"سپیرن۔؟"

"ہاں۔ سانپ پکڑنے والی سپیرن۔ پتا جی نے اُسے نوکر رکھا ہے۔ ایک سانپ پکڑنے پر اُسے آٹھ آنے ملیں گے!"

"مگر تیرے پتا نے تو مجھے بالکل نہیں بتایا.........." پھر وہ جلدی سے بولیں۔

"چل اچھا مجھے دکھا..... کدھر ہے وہ سپیرن۔؟"

میں ماں کو مالی کے گھر لے گیا۔ مالی کا گھر مٹی کا تھا۔ اور اس میں صرف دو کوٹھڑیاں تھیں۔ ایک کوٹھڑی میں سپیرن اپنے بال کھولے ایک ٹوٹا آئینہ اپنے سامنے رکھے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔

جب اس نے میری ماں کو اپنے سامنے دیکھا تو کنگھی کرتے کرتے رُک گئی۔ اس کی سبز آنکھیں یکایک یوں چمک اٹھیں۔ جیسے کوئی ندی کے گہرے پانی میں زور سے پتھر پھینک دے! پھر اس نے آہستہ سے اپنی آنکھیں جھکا لیں....

میری ماں اُسے ایک نظر دیکھ کر اُلٹے قدم لوٹ آئیں۔ باہر آ کر مالی سے بولیں جو اپنی بیمار بیوی کے پاؤں داب رہا تھا۔

"ارے یہ سانپ کیا پکڑے گی۔" یہ تو خود ناگن ہے ناگن۔"

میری ماں کا لہجہ بے حد تلخ تھا۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ماں اس کو ناگن کیسے کہہ رہی تھیں۔ سپیرن تو بالکل میری ماں کی طرح ایک عورت تھی۔ وہ ناگن کیسے ہو سکتی ہے۔ میرا خیال ہے۔ یہ بڑے لوگ کبھی کبھی انتہائی حماقت کی بات کر جاتے ہیں۔ اس لئے میں نے اپنی ماں سے کہہ دیا۔

"مگر وہ تو ایک عورت ہے جس طرح دوسری عورتیں ہوتی ہیں۔ ماں! تم نے اس کو ناگن کیسے کہہ دیا۔؟"

"تم نہیں سمجھتے۔" ماں تنک کر مجھ سے بولیں۔ "اور تم سے کس نے کہا ہے کہ بڑوں کی باتوں میں بولا کرو۔ میں تم سے دس بار کہہ چکی ہوں۔ بڑوں کی باتوں میں دخل نہ دیا کرو۔ ورنہ......!"

میں چپ ہو گیا۔ اور سہم کر ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ ماں جی مجھے جلدی جلدی چلا کر تقریباً دوڑا کر واپس بنگلے میں لے گئیں۔

رات کو جب میری ماں نے سمجھا کہ اب میں گہری نیند سو چکا ہوں۔ حالانکہ میں جاگ رہا تھا۔ اور محض آنکھیں بند کر کے بستر میں دبکا پڑا تھا۔ اس وقت میری ماں میرے پتا جی سے لڑنے لگیں......

"اس جنم جلی سپیرن کو تم نے نوکر رکھا ہے؟"

"ہاں!"

"کیوں؟"

"سانپ مارنے کے لیے۔"

"تو اس کام کے لیے کوئی سپیرا نہیں ملتا تھا۔؟"

"نہیں ہلانا جبھی تو اسے رکھا ہے۔!"

"میں نہیں مانتی۔"

"نہیں مانتی تو تم کوئی سپیرا لا دو۔ میں اسے نکال کر اسے رکھ لوں گا۔"

"کسی سپیرے یا سپیرن کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میں نے نہیں دیکھا کہ باغ میں کسی سانپ نے آج تک کسی کو کاٹا ہو۔"

"کاٹا نہ ہو مگر کاٹ تو سکتا ہے!"

"یہ تمہاری سب فضول باتیں ہیں۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ وہ سپیرن کل یہاں سے جائے گی۔"

"وہ نہیں جائے گی۔"

"وہ جائے گی۔"

وہ نہیں جائے گی۔"

"میں اسے جھاڑو مار مار کر نکال دوں گی۔"

میری ماں کہتے کہتے رونے لگیں۔

"پگلی ہوئی ہو۔" میرے پتا...... خفا ہو کے بولے۔ چند روز کی بات ہے جب وہ باغ کے سانپ پکڑ لے گی تو خود چلی جائے گی۔ دن بھر تمہارا بچہ باغ میں کھیلتا رہتا ہے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں۔ اس کے بھلے ہی کے لیے کہہ رہا ہوں۔

یہ سن کر یکایک میری ماں روتے روتے چپ ہو گئیں۔ جیسے ان کے دل کو یقین آ چلا ہو۔ بولیں۔

"سچ کہتے ہو؟"

اُن کے لہجے میں آدھا شک تھا آدھا یقین تھا۔
پتا جی نے میری ماں کے آنسو پونچھے اور انہیں پیار کر کے کہا۔
"پگلی اس قدر ناداں نہ بن۔ کیا تجھے ابھی تک میری محبت کا یقین نہیں ہے؟"
میری ماں نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر وہ کروٹ بدل کر میرے باپ کی بانہہ پر سو گئیں۔

مگر تین چار دن کے بعد انہوں نے پھر پتا جی سے لڑائی شروع کر دی۔ ہوا یہ تھا کہ میرے پتا کو بہیرن کے ساتھ ماں نے سیداں بی کے ٹیلے کے پیچھے کھسر پھسر کرتے دیکھ لیا تھا۔ ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی اب وہ چلا چلا کر کہہ رہی تھیں "یا تو اب میں یہاں رہوں گی یا وہ سبز آنکھوں والی ناگن رہے گی۔

اور پتا جی کہہ رہے تھے۔ آہستہ بات کرو۔ آہستہ بات کرو۔ کوئی سن لے گا۔ بچہ جاگ جائے گا۔

اور ماں جی کہنے لگیں۔ جاگ جائے بچہ سُن لے بچہ۔ میرا بچہ کیا۔ سارا جہاں سُن لے۔ تمہارے ایسا بے وفا مرد اس دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔ مجھے میرے میکے بھیج دو میں .... ایک پل کے لیے یہاں نہیں رہوں گی۔ اگر وہ موہنی کل یہاں سے نہیں جائے گی تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

"ان تین دنوں میں اس نے باغ سے بیس سانپ پکڑے ہیں۔"

"بیس پکڑے ہوں یا پچاس پکڑے ہوں میں کل اس کی چٹیا پکڑ کر اسے اپنے احاطے سے باہر پھینکوں گی!"

"تمہاری جیسی شکی عورت میں نے نہیں دیکھی۔ خواہ مخواہ شک کرنے لگ جاتی

ہو۔"

"تو تم اس کو یہاں رکھ کر میرا شبہ کیوں مضبوط کرتے ہو؟" میری ماں غصّے سے چلّائیں۔

"اچھا بابا۔ اچھا بابا۔ میں ہارا۔ تُو جیتی۔ میں اس کو ایک ہفتے کے بعد نکال دوں گا۔ اس ایک ہفتے میں جتنے سانپ باغ سے نکال سکتی ہے۔ اُسے نکال لینے دو۔ اس کے بیچ میں اس سے جھگڑا مت کر۔ اپنے دل کو ہلکان مت کر۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں تیرے بچّے کی حفاظت کے لیے کر رہا ہوں۔"

"اچھا تو بس ایک ہفتہ۔؟"

"ہاں! ایک ہفتہ۔"

"اور اس سے اوپر دن نہیں۔؟"

"ایک لمحہ نہیں!" میرے باپ نے میری ماں کو اپنے بازوؤں میں لے کر کہا۔ میں نے ایک آنکھ آہستہ سے کھولی اور پھر فوراً بند کر لی۔ میری ماں اطمینان کا سانس لے کر بولیں "جب تم اس طرح کرتے ہو تو میرے دل کو یقین آجاتا ہے۔"

میرے والد نے سپیرن سے کہہ دیا تھا کہ سات دن کے بعد اُسے یہاں سے چلے جانا ہوگا۔ اتنے دن میں وہ جتنے سانپ پکڑ سکتی ہے پکڑ لے۔

سپیرن ان کی بات سن کر چپ ہو گئی تھی۔ اس نے ایک بار غور سے میرے باپ کی طرف دیکھا تھا۔ مگر وہاں اپنے مطلب کی کوئی بات نہ پاکر وہ مایوس ہو گئی تھی اور چپ چاپ منہ موڑ کر سیداں بی کے ٹیلے کی طرف چل دی۔ اور وہاں پاؤں پسار کر زور زور سے بین بجانے لگی۔ آج اس کی بین میں مٹھاس نہ تھی جھستی نہ

بھی دُکھ نہ تھا۔ درد نہ تھا صرف غم اور غصہ تھا اور کچھ بے چین تڑپ تھی۔ جیسے ڈنگ سے خالی ناگن بل کھا کھا کر زہر مانگ رہی ہو۔!"

ساتویں دن ـــــ جس دن سپیرن جانے والی تھی۔ اس دن میری ماں کو ایک سانپ نے کاٹ کھایا۔ میری ماں برآمدے کی دیوار سے لگی۔ عشق پیچاں کی بیل کو پانی دے رہی تھیں کہ ان کے پاؤں کے نیچے نجانے کہاں سے ایک سانپ آگیا اور اس نے فوراً انہیں ٹخنے سے اوپر کاٹ کھایا۔ میری ماں۔ اُسی دم چیخ کر گر پڑیں اور دم بدم نیلی ہوتی گئیں۔

پتاجی نے آتے ہی جہاں پر سانپ نے کاٹ کھایا تھا وہاں پر نشتر سے شگاف کر کے بہت سا خون بہا دیا اور زخم میں پوٹاشیم پرمینگنیٹ بھر دیا۔

ان دنوں ہمارے ہاں سانپ کے زہر کے انجکشن نہیں ملتے تھے اور بس میرے پتاجی سانپ کے کاٹے کا یہی علاج کرتے تھے جس سے کبھی تو مریض بچ جاتے تھے اور اکثر اوقات مر جاتے تھے۔

میری ماں بے ہوش تھیں اور نیلی پڑتی جا رہی تھیں، اور ان کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا تھا اور میں، انہیں دیکھ کر رو رہا تھا.....

یکایک میرے پتاجی اٹھے اور سیدھے مالی کے گھر گئے۔ اس وقت سپیرن اپنا سامان باندھ چکی تھی۔ آج اس نے اپنا لہنگا اور قمیض دونوں دھو کر صاف ستھرے کر لئے تھے۔ بالوں میں کنگھی کی تھی۔

ندی کی نرم ریت سے رگڑ رگڑ کر اپنے چاندی کے زیور چمکا لئے تھے۔ اخروٹ کی چھال سے اپنے ہونٹ سُرخ کئے تھے اور بالوں میں گلاب کا ایک بڑا پھول لگا رکھا

تھا۔ اور اب وہ جانے کے لیے بالکل تیار تھی۔

"رانو چلو!"

"کہاں؟"

"وہ مر رہی ہے اُسے بچا لو۔!"

"نہیں اُسے مرنے دو۔!"

"نہیں رانو، مانو۔ اُسے بچالو۔ میری دوا کام نہیں کر رہی۔"

میرے پاس کوئی دوا نہیں ہے۔ میں سانپ پکڑتی ہوں، سانپ کا زہر دُور نہیں کر سکتی۔!"

"تم دور کر سکتی ہو۔ تم نے خود مجھے بتایا تھا کہ تمہارے پاس سانپ کے کاٹے کی بہترین دوا ہے!"

"وہ میں نے کہیں کھو دی ہے۔" سپیرن منہ موڑ کر بولی۔ اس کے لہجے میں انتہائی سختی اور بے زاری تھی۔

میرے پتا جی نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا۔ اور روتے ہوئے کہا۔ "نہیں رانو، مانو! اُسے بچالو۔ کسی طرح بھی بچالو۔ اگر وہ مر گئی تو میں بھی زندہ نہ رہوں گا!"

سپیرن نے پلٹ کر میرے باپ کی طرف دیکھا۔ آہستہ سے بولی۔

"اس کیلئے تم روتے ہو اور میرے لئے تمہارے پاس ایک آنسو بھی نہیں ہے۔"

میرے باپ نے سر جھکا لیا۔ اور چُپ چاپ سپیرن کے پاس کھڑا ہو گیا۔ خاموش

مجرم کی طرح۔!

سپیرن نے ایک آہ بھری اور اپنی دونوں پٹاریاں اٹھائیں اور بولی۔

"اچھا۔ جو تم چاہتے ہو، وہی ہوگا۔!" پھر وہ میرے والد کے ساتھ بنگلے کی طرف چلدی میری ماں کے پاس پہنچ کر سپیرن نے ماں کے زخم سے اپنے ہونٹ لگا دیئے اور اپنے ہونٹوں سے چوس چوس کر زخم کا بہت سا خون باہر تھوک دیا۔ پھر اس نے اپنے جھولے کو ٹٹول کر اس میں سے کالی سی ڈبیہ نکالی اور اسے کھول کر اس میں سے ایک سبز رنگ کا مرہم زخم پر لگایا اس کے بعد وہ باہر باغ میں دوڑی دوڑی گئی۔ اور دیر تک کچھ تلاش کرتی رہی۔ آخر ایک ڈھکی کے کنارے سے وہ ایک بڑے بڑے لمبوترے پتوں والا ایک پودا اکھاڑ لائی۔ اور ان پتوں کو ایک کھرل میں کوٹ کر ان کا رس نکال کے میری ماں کے ہونٹوں میں ٹپکانے لگی۔

دو گھنٹے کے بعد میری ماں کے منہ سے جھاگ نکلنا بند ہوگیا۔ پھر دھیرے دھیرے میری ماں نے آنکھیں کھولیں اور جب اس نے آنکھیں کھولیں، تو سپیرن آہستہ سے پرے ہٹ گئی اور میرے پتاجی آگے آگئے انہوں نے بڑے پیار سے میری ماں کا چہرہ اپنے زانو پر لے لیا، اور پوچھا۔

"اب کیسی ہو؟"

میری ماں نے کمزور آواز میں کہا۔" معلوم ہوتا ہے بچ جاؤں گی۔ میرا لال کہاں ہے؟"

میں روتا ہوا اپنی ماں کے گلے سے لگ گیا۔ تھوڑی دیر میں ——— میں اماں اور میرا باپ، ہم تینوں خوشی کی سسکیاں بھر رہے تھے ......

یکایک میرے والد کو کچھ یاد آیا۔ انہوں نے کہا۔

" جانکی تمہیں معلوم ہے۔ تمہاری جان کس نے بچائی ہے ؟"

ماں نے خاموشی سے انکار میں سر ہلایا۔

میرے باپ نے پلٹ کر کہا۔

" رانو آگے آؤ۔!!"

مگر جب میرے باپ نے پلٹتے ہوئے یہ فقرہ کہا تو اس وقت وہاں کوئی نہ تھا۔

سپیرن جا چکی تھی۔

سپیرن پھر کبھی لوٹ مار کر ہمارے علاقے میں نہیں آئی: سردی کی راتوں میں جب چاروں طرف برف پڑتی ہے تو کبھی کبھی ندی کے اُس پار بین کی تڑپتی ہوئی صدا آتی ہے۔ جسے سُن کر میرے والد کمرے سے باہر نکل آتے ہیں اور بے چین ہو کر برآمدے میں ٹہلنا شروع کر دیتے ہیں اور وہ آواز دور ندی کے پانیوں سے پرے ہوا کے دوش پر اڑتی ہوئی اس طرح ہوتی ہے۔ جیسے ویران برف زاروں میں کوئی بالک کھو جائے۔ اور بلک بلک کر اپنا راستہ پوچھے......؟

آئینہ خانے میں

ہر انسان کو آئینے میں اپنی صورت اچھی نظر آتی ہے۔ نہ آئے تو وہ آئینہ دیکھے ہی
کیوں؟ اس میں آئینے کا اتنا قصور نہیں ہے۔ جتنا دیکھنے والے کا۔
دراصل ہر انسان آئینہ دیکھتے وقت اپنے اندر سے ایک دوسرا آئینہ نکال کر
اسے اپنے آئینے میں چھپا کر رکھ دیتا ہے اور اس میں اپنی صورت دیکھتا ہے۔ پھر
یکایک دنیا بدل جاتی ہے۔ بچہ جوان ہو جاتا ہے۔ ۔ بدصورت
عورت حسین ہو جاتی ہے۔ قاتل فرشتہ بن جاتی ہے۔

میں اندر کے آئینے کو توڑ دینے کے حق میں نہیں ہوں۔ کیونکہ اسی عمل سے پیاسے کو پانی
ملا ہے۔ بھوکے کو روٹی ملی ہے اور جاہل نے تہذیب کا گیت سنا ہے۔ یہ خود فریبی سراسر دھوکا
نہیں ہے۔ اپنے آپ کو بدل دینے کی ایک لاشعوری کوشش بھی ہے۔

جب کوئی شخص اپنی تعریف کرتا ہے۔ تو وہ صرف یہ نہیں کہتا۔ دیکھو، دیکھو میں
کتنا اچھا ہوں — وہ یہ بھی کہتا ہے، ہائے! میں کتنا اچھا ہو سکتا تھا۔ اس کی تعریف میں
خود کی محرومی کا راز اور اس کے مستقبل کی لاش چھپی ہوئی ہے۔ اور محرومی ہر انسان کے حصے میں آتی

ہے۔ چاہے وہ ادیب ہو، بڑھئی ہو۔ یا وزیر اعظم ہو۔ اس محرومی سے خالی نہیں ہے۔ ہر اعتبار سے آسودہ انسان کو اپنی تعریف کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ خود زندہ رہنے کی ضرورت ہی کیا؟ زندگی تو محرومی اور مسرت کے درمیانی فاصلے کو کہتے ہیں۔

ممکن ہے آپ نے اپنی زندگی میں چند آسودہ انسان دیکھے ہوں۔ مَیں نے بھی دیکھے ہیں۔ خوب کھائے پئے۔

پیٹ بھرے۔ عمدہ کپڑوں، گھروں، رشتوں میں گھرے ہوئے۔ خوب صورت۔ صحت والے۔ گول مٹول چہروں والے انسان جن کی زندگی میں کوئی تلاش نہیں۔ جذبات میں کوئی ہیجان نہیں۔ دماغ میں سوچ نہیں۔ دل میں کوئی آئینہ نہیں! انہیں دیکھ کر میرے دل کے آئینے میں کسی انسان کی صورت نہیں بنتی زیادہ سے زیادہ ایک اُبلے ہوئے آلو کا خیال آتا ہے۔

لیکن اس وقت میں آلوؤں کی بات نہیں کرنا چاہتا۔ انسانوں کی بات کرنا چاہتا ہوں جو میری اور آپ کی طرح شب و روز آئینہ دیکھتے ہیں۔ کچھ کھوتے ہیں کچھ تلاش کرتے ہیں۔ میں اپنے دل کا آئینہ آپ کے سامنے رکھتا ہوں کیونکہ آپ اس میں میری صورت دیکھ لیں اور کسی حد تک اپنی بھی۔

میں کیوں پیدا ہوا —— ؟ اس کا جواب میں کیا، میرے ماں باپ بھی نہیں دے سکتے۔ کسی ماں کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا بیٹا بڑا ہو کر قاتل بنے گا۔ ورنہ وہ اُسے پیدا ہی نہ کرتی۔ غالباً مریم کو معلوم نہ تھا کہ اس کا بیٹا یسوع مسیح ہوگا۔ ورنہ وہ اُسے پھانسی سے بچالیتی۔

مائیں بڑی رحمدل ہوتی ہیں۔ مجھے یقین ہے اگر مائیں اپنے دل کے آئینے میں شروع سے آخر تک اپنے بچے کی زندگی دیکھ سکتیں، تو آج صفحہ ہستی پر کسی انسان کا وجود نہ ہوتا۔ یا تو

فرشتے یا پھر اُبلے ہوئے آلو۔ ایک ہی بات ہے۔

اس لیے میرا سن ولادت، جائے ولادت، یوم ولادت اہم نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ جب میں پیدا ہوا اور زندگی کے آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو میں رو دیا تھا۔

بچپن کی کچھ دھندلی صورتیں یاد ہیں۔ راجہ صاحب کے محل کا ایک حصہ تھا۔ چند دیواروں کے کنگورے اور برجیوں سے گھرا ہوا ایک چوکور صحن تھا۔ میرے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا تھا۔ جس پر مکھن لگا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں دودھ کی کٹوری تھی۔ دیوار سے ایک کوا کائیں کائیں کرتا ہوا آیا اور چونچ مار کر میرے ہاتھ سے روٹی چھین کر لے گیا۔

ایک برجی سے ایک بندر چھلانگ مار کر آیا اور میرے ہاتھ سے دودھ کی کٹوری لے کر چلتا بنا اور میں ایک بے بس بچے کی طرح خالی ہاتھ پھیلائے فرش پر بیٹھا بیٹھا زور زور سے رونے لگا۔ اس کے آگے کیا ہوا ؛ مجھے کچھ یاد نہیں۔

صرف اتنا یاد ہے کہ ایک بندر نے میرا دودھ چھینا تھا۔ ایک کوے نے میری روٹی اور مکھن۔ تین برس کی عمر میں میں اپنے عہد کی انسانی زندگی کے ایک بہت بڑے المیے سے آشنا ہوا۔ جہاں ہر وقت ہر انسان کی روٹی اور مکھن چھن جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ گو مجھے اس وقت یہ بات معلوم نہیں ہوئی۔ کہ میرا اپنا دودھ، روٹی اور مکھن بھی کسی دوسرے بچے کا چھنا ہوا تھا۔

یہ بات بہت بہت دیر میں سمجھ میں آئی۔ لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ مزدور روز روٹی کی پوٹلی باندھ کر کارخانے کیوں جاتے ہیں ؟ بیویاں رات کو دروازے پر کھڑی ہو کر اپنے خاوندوں کا انتظار کیوں کرتی ہیں ؟

کلرک سہمے سہمے دفتروں کو کیوں جاتے ہیں؟ اور سر جھکا کر۔ گویا آسمان سے برستی ہوئی گالیوں کو کیوں سنتے ہیں؟ اور اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ لوگ خود غرض کیوں ہوتے ہیں؟ اپنے دوستوں کو دھوکہ کیوں دیتے ہیں۔ بنک میں پیسہ کیوں جمع کرتے ہیں؟ ان سب کے ذہن میں کہیں نہ کہیں میری طرح کوئی بندر یا کوا آکاتار رہتا ہے۔

ایک چھوٹی سی لڑکی تھی۔ جس کا نام چندر مکھی تھا۔ اور وہ اپنے نام ہی کی طرح بے حد حسین تھی۔ اور وہ تپتی دوپہروں میں اِملی کے پیڑوں تلے میرے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ خود بعد میں کھاتی تھی۔ پہلے مجھے کھلاتی تھی۔

اِملی توڑ کر میرے ہاتھ میں دیتی تھی اور میں اس قدر خود غرض تھا کہ کبھی یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ لڑکی اپنے ہاتھ کی توڑی ہوئی اِملی کس طرح کسی دوسرے فرد کے حوالے کر سکتی ہے چاہے وہ اس کا بھائی کیوں نہ ہو۔ وہ مجھ سے بہت بڑی نہیں تھی۔ پھر بھی جب میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا تھک جاتا اور رونے لگتا۔ تو وہ چھوٹی سی لڑکی ہمت کر کے مجھے اٹھا کر اپنی کمر پر رکھ لیتی تھی اور پھولتی ہوئی سانسوں کے درمیان پسینہ پسینہ ہوتی ہوئی مجھے اٹھا کر چند گز چلی جاتی تھی۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کوئی کیوں کسی دوسرے کو اٹھائے، اُسے پچکارے، پیار کرے۔ اس کی حفاظت کرے۔ میں نے تو کبھی کسی کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا تھا۔

پھر ایک دن چندر مکھی کی شہ رگ کے قریب ایک خوفناک ناسور ابھرا۔ اور کئی سال تک میرے والد مختلف جگہوں پر اس کا علاج کرنے کے لیے گھومتے رہے۔ مجھے ہسپتالوں کے کمرے یاد ہیں۔ دواؤں کی بوئیں اور مریضوں کا تڑپنا اور ہسپتال کے ملازموں کی بے رحمی، اور پیپ اور خون اور پٹیاں اور نیم اندھیرے کمرے میں چندر مکھی کا میری ماں کے

سینے سے لگ کر بلکتا......

اچھا ہوا وہ بہت جلد مرگئی اور میں بہت جلد اپنی زندگی کے انجام سے واقف ہوگیا۔ افسوس اس بات کا نہیں ہے کہ موت بے رحم کیوں ہے ؟ افسوس اس بات کا ہے کہ ہسپتال بے رحم کیوں ہے ؟ وہ اگر ایک ناسور ٹھیک نہیں کر سکتے تو دوسرا تو نہ دیں۔

مرتے وقت چندر مکھی کا چہرہ مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ وہ آٹھ سالہ لڑکی ایک اسی سالہ معمر عورت کی با وقار متانت کے ساتھ مری تھی۔ بھور ہو گئی تھی اور ہسپتال کے وارڈ کے سامنے جامن کے پیڑ پر چڑیاں بھی پھدکنے لگی تھیں اور ہوا میں ایک مہکتی ہوئی تازگی تھی۔ ایسے میں شاید چندر مکھی کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ جا رہی ہے۔ اس زندگی میں یہ عجیب بات ہے اور شاید ایک خوبصورت بات بھی ہے کہ اس زندگی میں آنے کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن اکثر جانے کا پتہ چل جاتا ہے۔ کوئی اندر کی ایک انجانی حس ہوتی ہے۔ جو دل پہ انگلی رکھ دیتی ہے اور مسافر چونک کر سفر کے لئے بیدار ہو جاتا ہے۔ چندر مکھی کے ساتھ بھی اس صبح یہی ہوا۔ وہ چونک کر اٹھی۔ اس نے ماں کو جگایا۔ اس نے کہا کہ وہ اس کا منہ دھلائے اس کا فراک بدل دے۔ اس کے بالوں میں ربن لگا دے۔ شاید وہ ربن نہ تھا۔ موت کا تمغہ تھا۔ جسے چندر مکھی نے بڑی بہادری سے پہن لیا تھا۔ پھر چندر مکھی نے مجھ سے بہت پیار کیا۔ مجھے ایسی ایسی دعائیں دیں، جو ایک بہن ہی اپنے بھائی کو دے سکتی ہے پھر اس نے اپنے باپ کی گود میں اپنا سر رکھ دیا اور میری ماں نے اس کی ٹانگیں اپنی آغوش میں رکھ لیں۔ اور وہ بہادر لڑکی چراغ کی لو کی طرح آہستہ آہستہ کم ہوتی ہوئی میری آنکھوں کے سامنے بجھ گئی۔

دوسروں کے لئے تو نہیں، ہاں میرے لئے چندر مکھی کی یہ چند دھندلی دھندلی

یادیں اور تصویریں کسی نہ کسی طرح میرے ذہن اور شعور میں رچ بس کر مجھے عورت کی بنیادی تہذیب اور شرافت سے آگاہ کر گئی ہیں۔ ماں سے تو گویا بچہ اس کی آنول سے بندھا ہوتا ہے۔ اس لئے بچہ میرے خیال میں ماں سے بہت کم سیکھتا ہے۔

عورت کی لطافت کا پہلا سبق اُسے اپنی بہن سے ملتا ہے اور آخری اپنی محبوبہ سے۔ اور یوں ہی اسی طرح اس کے دل کے آئینہ خانے میں محبت کا تصور مکمل ہوتا ہے اور بیچ میں بہت سے مقام آتے ہیں۔ کیونکہ مرد کی محبت، عورت کی محبت کی طرح ایک واحد مکمل مجرد تجربہ نہیں ہے۔

ایک مسلسل سفر ہے۔ اپنی محبوبہ تک پہنچنے کے لیے۔ جس میں کبھی کبھی ساری زندگی بیت جاتی ہے مگر میں اس کا ذکر آگے کروں گا۔

لیکن اس سے بھی بڑا کام جو جیندر سکھی نے کیا تھا وہ یہ تھا کہ اس نے میرے دل سے موت کا ڈر نکال دیا۔ ناگزیر ہونے کے باوجود موت کا تصور ہر زندہ انسان کے لیے بڑا بھیانک ہے اور جوں جوں زندگی اپنے انجام کے قریب ہوتی جاتی ہے۔ اس تصور کی گرفت اور بھی مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ اس انجام کو کوئی نہیں روک سکتا۔ پچاس برس کی عمر میں نہ سہی تو سو برس کی عمر میں یا ڈیڑھ سو برس کی عمر میں ہمیں اس انجام کو پہنچنا ہے۔ ناسور سے نہ سہی تو کسی دوسرے مرض سے۔ حادثے سے، قتل سے، شہادت سے یا طبعی موت سے ہمیں ایک نہ ایک دن اس انجام کو پہنچنا ہے۔

یہ ایک قطعی امر ہے۔ لیکن اس قطعیت سے بھی دل کو قرار نہیں آتا۔ دنیا کا کوئی مذہب اور افکار اور فلسفے کا کوئی سلسلہ موت کے کرب اور خاتمے کے خوف کو انسان کے دل سے پوری طرح نکال دینے سے قاصر ہے۔

اس ڈر سے بچنے کے لیے شاید ایک بچے کے ذہن کی شاعری اور اُس معصومیت کی ضرورت ہے جو موت کو ایک ربن کی طرح پہن لے اور مسکراتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو جائے۔ جس طرح ایک ملگجی سحر میں چندر مکھی رخصت ہوئی تھی۔

میں ایک کمزور انسان ہوں۔ مگر جی اس طرح مرنے کو چاہتا ہے۔ اور دل چاہتا ہے کہ جب زندگی ختم ہو جائے اور موت کا فرشتہ میری روح قبض کرنے کو آئے تو میں مسکرا کر اس کا استقبال کروں۔ اور ایک دوست کے ناطے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے دُور دراز کے کسی جزیرے میں لے جا کر ایک ایسی طویل اور خوب صورت کہانی سناؤں، جسے سن کر وہ حسین خیالوں میں کھو جائے اور چند ساعتوں کے لیے کسی بچے کی جان لینا بھول جائے۔

ادیب جب کہانی لکھتے ہیں تو وہ دراصل موت سے لڑتے ہیں، کسی انسان کی زندگی مہابھارت سے خالی نہیں رہی۔

فرق صرف اتنا ہے کہ وہ خود ہی گُرو ہے، خود ہی پانڈو ہے، تو دبی کرشن اور ارجن ہے۔ وہ خود ہی رتھ میں بیٹھتا ہے اور خود ہی اسے چلا کر کارزارِ حیات میں لے جاتا ہے اور انگلی اٹھا کر کہتا ہے۔

"سن اے ارجُن!"

میرے لڑکپن اور جوانی کے دن بڑے خوب صورت رنگوں سے معمور ہیں۔ کشمیر کی جھیلیں اور آبشاریں، پہاڑ اور وادیاں۔ دھان کے کھیت اور زعفران کی خوشبو، گھٹا عورت کی آنکھوں کی طرح برستی ہوئی۔ اور آپ نے دھنک کے سات

رنگ دیکھے ہوں گے۔ لیکن میں نے دھنک میں اتنے رنگ دیکھے ہیں۔ جو میری دو زندگیوں کے لیے کافی ہیں۔ لیکن زندگی تو صرف ایک ہے اور ادیب بہت سے لوگوں سے بہت زیادہ حساس ہوتا ہے۔ اس لئے میں کیا کروں۔ ان آنکھوں کا کہ میں نے دھنک کے رنگ نہیں دیکھے۔ میں نے بھوک کا رنگ بھی دیکھا ہے صرف دھان کے کھیت ہی نہیں دیکھے، ان کھیتوں میں کھڑے ہوئے کسانوں کو بھوکا بھی دیکھا ہے۔ میں نے زعفران کی خوشبو ہی نہیں سونگھی۔ اُس بدبو کو بھی سونگھا ہے۔ جو متعفن کپڑوں اور گلے سڑے چیتھڑوں سے آتی ہے۔

میں نے برف کے بے داغ گالوں میں لوگوں کو سردی سے مرتے اور ٹھٹھرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اب کوئی آنکھ، کان، دل اور دماغ بند کر کے کیسے لکھ سکتا ہے۔؟

اندر کی دُنیا!۔

اندر کی دُنیا کے بارے میں میں نے بہت سوچا ہے۔ لیکن مجھے آج تک یہی معلوم نہ ہو سکا کہ اندر کی دنیا کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اور باہر کی دنیا کہاں ختم ہوتی ہے۔ مجھے تو اندر اور باہر کی دُنیا ایک سی نظر آتی ہے۔ میرے دل کے اندر جو آئینہ ہے۔ اس کا ایک ایک ٹکڑا میں نے زندگی کی سڑکوں، بازاروں، گلیوں، محلوں اور چوکوں سے چُنا ہے۔

ایک ٹکڑا میں نے عورت کے سنگار میز سے اٹھایا ہے۔ تو دوسرا کوڑے کے ڈھیر سے۔ ایک ٹکڑا مجھے جھیل میں غوطہ لگاتے ہوئے تہہ آب سے ملا تھا۔ تو دوسرا صحرا کی ریت چھانتے ہوئے۔

ایک ٹکڑا تراش کر نگینے کی طرح انگوٹھی میں لگ گیا تو دوسرا دھاردار ہو

کرتلوؤں سے میں اتر گیا۔ شاید میری ساری زندگی کانچ کی اِن کرچیوں کو جمع کرتے کرتے گذر جائے گی اور پھر بھی دل کا آئینہ خانہ مکمل نہ ہو سکے گا۔ اس لئے میں مکمل طور پر آپ کو اپنے بارے میں کبھی نہ بتا سکوں گا۔ کیونکہ میں خود مکمل نہیں ہوں۔ اور میں اِس لیے مکمل نہیں ہوں، نہ بُدی میں نہ نیکی میں، نہ خوب صورتی میں، نہ بدصورتی میں، نہ تخیل میں نہ حقیقت میں، نہ تشنگی میں نہ سیرابی میں، کسی طرح مکمل نہیں ہوں۔ کیونکہ ابھی میری نظر میں میرا خدا بھی تکمیل نہیں ہے۔

لیکن میں اسے مکمل ضرور کر دینا چاہتا ہوں۔ اگر وہ ایک گھر ہے۔ تو میں اس میں ایک اینٹ ضرور لگانا چاہتا ہوں۔ اگر وہ ایک آئینہ ہے۔ تو میں اس میں کانچ کا ایک اور ٹکڑا جوڑ دینا چاہتا ہوں۔ اگر وہ ایک دھنک ہے۔ تو میں اس میں ایک رنگ اور سمو دینا چاہتا ہوں۔ میں بے نور آنکھوں کے سارے گڑھے پاٹ دینا چاہتا ہوں۔ اور انہیں جھیلوں کی طرح لبریز کر دینا چاہتا ہوں۔ زندگیاں جو پہاڑ کی طرح بلند ہوں۔

فراغتیں جن سے زعفران کے پھولوں کی مہک آئے۔ ہمدردیاں جو آبشار کی طرح انسان کے سینے میں بہتی ہوں۔ کپڑے جو پتوں کی طرح شفاف اور چکنے اور سورج کی کرنوں سے نمو حاصل کرتے ہوں۔

میں جانتا ہوں کہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ لیکن میں نے اپنی زندگی میں کبھی اپنے آپ کو اکیلا محسوس نہیں کیا۔ سورج کی ہر کرن میری ساتھی ہے۔ اکیلے لوگ بڑے بدنصیب ہوتے ہیں۔

میں نے تو اپنی بھوک میں بھی اپنے آپ کو اکیلا نہیں پایا۔ میری پیاس کبھی

میری نہیں رہی۔ میری بے کاری میں کروڑوں لوگ شامل رہے اور بہت سے ملک اور کئی صدیاں، میں ایک ہجوم ہوں۔ قافلہ ہوں۔ سفر ہوں۔ تاریخ کا چلتا ہوں سانس ہوں یعنی ایک معمولی آدمی ہوں۔

نہ جانے دنیا نے یہ کیسے تصوّر کر لیا ہے کہ ادیب اس دنیا کا آدمی نہیں ہوتا۔ بلکہ دوسرے نظام شمسی کی مخلوق ہے۔ عجیب عجیب باتیں اس سے منسوب کر دی جاتی ہیں۔ ایسی نیکی جو فرشتوں سے بھی ممکن نہیں، ایسی پاکیزگی جو دیوتاؤں کے حصّے میں بھی نہیں آئی۔

جسے چھوتے ہوئے خدا بھی ڈر جائے۔ لیکن یہ سب صفات نہ جانے کیسے ایک دم ایک ادیب کی فطرت میں دیکھ لی جاتی ہیں۔ یا فرض کر لی جاتی ہیں۔ حالانکہ میرا خیال ہے کہ ایک ادیب اُتنا ہی جھوٹا، لپاڑیا، دھوکے باز، خود غرض، کمینہ اور تنگ دل ہوتا ہے۔ جتنا کوئی دوسرا آدمی ہو سکتا ہے اور مجھ میں یہ سب خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

میں نے بارہا جھوٹی قسمیں کھائی ہیں جھوٹے وعدے کئے ہیں۔ اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکے دیئے ہیں۔ خوشامد کی ہے۔ لڑا ہوں، جھگڑا ہوں، شراب پی ہے، بھنگ اور چرس پی۔ میں اپنی تعریف سے خوش ہوا ہوں۔ اور دوسروں کی تعریف سے جل گیا ہوں۔

جب کسی سے کام پڑتا ہے تو میں اس کے پیچھے لگ جاتا ہوں اور کام ہوتے ہی اُسے ایسا فراموش کرتا ہوں کہ جیسے وہ کبھی میری زندگی میں تھا ہی نہیں۔

کئی بار میرے دوستوں نے مجھ سے اُدھار مانگا۔ اور میں نے نہیں دیئے۔

کئی بار جب میں نے اُدھار مانگا اور مجھے پیسے نہیں دیئے گئے۔ تو میں نے دل ہی دل میں اپنے دوست کو گالی دی۔

کئی بار میں نے سڑک پر چلتی ہوئی اجنبی عورتوں کو اغوا کر لیا۔ کیوں کہ وہ خوبصورت تھیں۔ اب اگر وہ صحیح سلامت حفاظت سے اپنے گھر چلی گئیں تو یہ ان کے قانون کی خوش قسمتی ہے۔ ورنہ جہاں تک میرے ارادے کا تعلق ہے میں اغوا کر چکا ہوں۔

اسی طرح کئی بار کسی کی بات سے طیش کھا کر میں نے اسے قتل کر دیا ہے اب اگر وہ شخص زندہ ہے اور چلتا پھرتا ہے تو محض اپنی جسمانی قوت کے بل بوتے پر، ورنہ جہاں تک میرا تعلق ہے میں اسے قتل کر چکا ہوں۔

میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اب تک اسی طرح پچاس عورتیں اغوا کر چکا ہوں اور دو سو آدمی قتل کر چکا ہوں۔ اُن میں خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری، راجندر سنگھ بیدی، ماؤزے تنگ، ونسٹن چرچل، دلیپ کمار، دھرم ویر بھارتی اور مہندر ناتھ میرا سگا بھائی بھی شامل ہے اور کنتو گلی کی بھنگن جو میرے گھر میں ٹھیک طرح سے جھاڑو نہیں دیتی ہے اور رام دیال نکڑ کا بنیا، جس کا بل میں نے چھ ماہ سے ادا نہیں کیا ہے اور دادر ہیر کٹنگ سیلون کا عبدل حجام۔ جو ہر ماہ میرے ہاتھ بال اُگانے کا ایک نیا تیل بیچ دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور لینڈ لارڈ جسے میں ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو —— قتل کرتا ہوں۔ کم بخت ہر دوسرے ماہ کی پہلی تاریخ کو پھر دروازے پر آن کھڑا ہوتا ہے۔ ایسا معجزہ تو آپ نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔

فطرت نے یکسانیت کو توڑنے کے لیے تضاد کے عمل کو تجویز کیا...... روشنی اور اندھیرا، پانی اور آگ، مرد اور عورت ظہور میں آئے۔ میں یہ نہیں مانتا کہ مرد اور عورت

صرف بچہ پیدا کرنے کے لیے مامور کئے گئے ہیں۔ ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میرے ہاتھ میں بچہ پیدا کرنے کی طاقت ہوتی اور میری ران پر ایک ہتھیلی لگی ہوتی۔ میں اپنا ہاتھ اپنی ران پر رکھتا اور ہتھیلی بڑھنے لگتی اور نو ماہ کے بعد بچہ پیدا ہو جاتا اس طرح عورت دردِ زہ کی مصیبت سے بچ جاتی اور فطرت عورت کی تخلیق سے۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسی با (AMSEPA) کی طرح چلتے چلتے میرے دو ٹکڑے ہو جاتے۔ اور ایک کرشن چندر کو لاہے کو چلا جاتا۔ اور دوسرا ملاڈ کو۔

الگ الگ اپنی ذات میں مکمل اور خود مختار۔ مگر فطرت نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے مرد اور عورت بنائے ان میں تضاد رکھا۔ کھنچاؤ اور کشش۔ اس کشش سے وہ ایک دوسرے کے ساتھی بنے۔ ساتھ رہنے سے گھر بنا۔

گھر کے لیے محنت کی گئی۔ عورت سے سماج پیدا ہوا۔ اور سماج سے معاشرہ۔ یہ پیچیدہ خوب صورتی ایک دوسرے میں گتھی ہوئی۔ ایک دوسرے پہ انحصار کرتی ہوئی وہ لچک

عورت کی تخلیق کائنات کی رمزیت کی طرف ایک نہایت ہی لطیف اشارہ ہے۔

میری زندگی میں بہت سی عورتیں آئیں۔ حالانکہ قاعدے سے صرف ایک آتی تو اچھا ہوتا۔ مگر زندگی کی طرح محبت بھی ایک بہت پُر پیچ عمل ہے۔ کبھی کبھی جسے آپ محبت سمجھے ہیں، وہ محض ایک پسند ہوتی ہے۔ جنسی بھوک ہوتی ہے۔

ماں باپ کی مرضی ہوتی ہے۔ خدا ترسی ہوتی ہے۔ اخلاقی مجبوری ہوتی ہے یا صاف بداخلاقی ہوتی ہے۔

ایسی محبت سے اگر شادی ہوتی ہے تو ناکام رہتی ہے۔ گھر بنتا ہے تو ویران ہوتا ہے۔ زندگی ہوتی ہے تو کدو کی طرح ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے پھولتی جاتی ہے اور کبھی انسان کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ وہ انسان ہے کہ کدو؟

میں محبت کا مفہوم بہت دیر میں سمجھا، اور دیر تک بھٹکا۔ اور بہت سے گناہوں کے داغ میں نے اپنے سینے پر لے لئے اور اپنے دل کے آئینہ خانے کو بار بار طرح طرح کی صورتوں سے سجایا۔ لیکن کہیں پہ مجھے وہ صورت نہ مل سکی۔ جس کی تلاش میں میں عرصے سے سرگرداں تھا۔

کیونکہ کسی انسان کا آئینہ اُس کی محبت کے چہرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں اپنے دل کے زخم لئے ہزار وادیوں میں بھٹکا اور سینکڑوں راتوں کے رُو پہلے لمحوں میں اس ایک لمس کو ڈھونڈتا رہا۔

جسے صرف ایک بار چھُو لینے سے ہی میں کندن ہو سکتا تھا۔ دوستوں کی محفل میں اور دشمنوں کے گھر میں۔ گلی گلی، محلے محلے میں اس چہرے کو ڈھونڈتا رہا۔ جس کے نقوش اور خدوخال سے میں ناواقف تھا۔ لیکن جو میرا ہو سکتا تھا۔ اور میں اُس کا۔ اور جب وہ چہرہ مجھے مل گیا اور میں نے اُسے پہچان لیا، اور اس نے مجھے، جب میرے گناہ اُسے اپنے معلوم ہوئے اور اس کے زخم میرے دل میں پیوست ہو گئے تو میری، تلاش ختم ہو گئی۔

اب میرا جی کسی کو قتل کرنے کو نہیں چاہتا۔ سب کو معاف کر دینے کو چاہتا ہے۔

لیکن زندگی باقی ہے اور اس کے خواب اُدھورے ہیں۔ میرے دشمن وزیر ہو گئے

ہیں یا کانٹریکیڑ اور عظیم جاہ وحشمت کے مالک ! وہ پہلے سے زیادہ شدت سے مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔

میرے دوستوں نے بھی چھوٹے چھوٹے گھر خریدے ہیں، ننھے ننھے بنگلے اور فلیٹ گاڑیاں اور اب ان کی نگاہوں میں آسودگی، آرام اور طمانیت کی جھلک ہے۔ اور سلام ہو ان سب کی زندگیوں پر اور دنیا کی تمام برکتیں نازل ہوں۔ میرے تمام دوستوں اور دشمنوں پر۔ کیونکہ میں نے صرف خواب دیکھے ہیں۔

میں نے کوئی گھر نہیں بنایا۔ اور کسی کو بہت فیض نہیں پہنچایا۔ اور کبھی بڑا آدمی نہیں بن سکا۔ کیوں کہ میں نے صرف خواب دیکھے ہیں اور وہ سب خواب تھے۔ سب جھوٹے سپنے تھے۔

ایک دن میں نے ایک خواب دیکھا کہ اس دنیا کے سب انسان برابر ہیں، وہ بھی ایک جھوٹا سپنا تھا۔

ایک دن میں نے خواب دیکھا کہ اِس دنیا میں کوئی کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ وہ بھی ایک جھوٹا سپنا تھا۔

ایک دن میں نے خواب دیکھا کہ اس کرۂ ارض پر تمام انسان امیر ہو گئے ہیں۔ یعنی سب نے مل کر ایک دوسرے کی غریبی آپس میں بانٹ لی ہے۔ وہ بھی ایک جھوٹا سپنا تھا۔

لیکن یہی جھوٹے سپنے مجھے سب سے زیادہ عزیز ہیں۔ یہی میرا گھر ہیں۔ یہی میری محبت، میری زندگی اور اس کا حاصل۔ میں ہرگز کوئی بڑا آدمی نہیں ہوں۔ میری کل کائنات یہی جھوٹے سپنے ہیں!

لہو کے چراغ

امرتسر

جلیان والا باغ میں ہزاروں کا مجمع تھا۔ اس مجمع میں ہندو بھی تھے۔ سکھ بھی تھے اور مسلمان بھی، ہندو مسلمانوں سے اور مسلمان سکھوں سے الگ صاف پہچانے جاسکتے ہیں صورتیں الگ تھیں۔ مزاج الگ تھے۔ تہذیبیں الگ تھیں۔ مذہب الگ تھے لیکن آج یہ سب لوگ جلیان والا باغ میں ایک ہی دل لے کر آئے تھے۔ اس دل میں ایک ہی جذبہ تھا اور اس جذبے کی تیز و تند آنچ نے مختلف تمدن اور سماج ایک کر دیئے ہیں۔ دلوں میں انقلاب کی ایسی پیہم رَو تھی کہ جس نے آس پاس کے ماحول کو بھی گرما دیا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس شہر کے بازاروں کے ہر پتھر اور اس کے مکانوں کی ہر ایک اینٹ اس خاموش جذبے کی گونج سے آشنا ہے اور اس لرزتی ہوئی دھڑکن سے نغمہ ریز ہے۔ جو ہر لمحے کے ساتھ گویا کہتی جاتی ہے۔ آزادی، آزادی، آزادی۔۔۔۔

جلیان والا باغ میں ہزاروں کا مجمع تھا اور سبھی نہتے تھے اور سبھی آزادی کے پرستار تھے۔ ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں نہ ریوالور۔ برین گن نہ سٹین گن، ہینڈ گرینڈ نہ تھے۔ دیسی یا ولائتی ساخت کے بم بھی نہ تھے۔ مگر کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی نگاہوں میں گرمی کسی بھونچال کے قیامت خیز لاوے کی حدت کا پتہ دیتی تھی۔ سامراجی فوجوں کے پاس لوہے کے

ہتھیار تھے۔

یہاں دل فولاد کے بن گئے تھے اور روحوں میں ایسی پاکیزگی سما گئی تھی جو صرف اعلیٰ اور ارفع قربانی سے حاصل ہوتی ہے۔ پنجاب کے پانچوں دریاؤں کا پانی اور ان کے رومان، اور ان کا سچا عشق اور ان کی تاریخی بہادری آج ہر فرد، لبشر بچے، بوڑھے، کے ٹمٹماتے ہوئے رخساروں میں تھی۔ ایک ایسا اُجلا اُجلا غرور کہ جو اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب قوم جوان ہو جاتی ہے اور سویا ہوا ملک بیدار ہو جاتا ہے۔ جنہوں نے امرتسر کے یہ تیور دیکھے ہیں وہ ان گروؤں کے اس مقدس شہر کو کبھی نہیں بھلا سکتے۔

جلیان والا باغ میں ہزاروں کا مجمع تھا۔ اور گولی بھی ہزاروں پر چلی تینوں طرف سے راستہ بند تھا اور چوتھی طرف ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ یہ دروازہ جو زندگی سے موت کو جاتا تھا۔

ہزاروں نے خوشی خوشی جامِ شہادت پیا۔ آزادی کی خاطر، ہندو۔ مسلمانوں اور سکھوں نے مل کر اپنے سینوں کے خزانے لٹا دیئے تھے اور پانچوں دریاؤں کی سرسبز زمین میں ایک چھٹے دریا کا اضافہ کیا تھا۔

یہ ان کے ملے جلے خون کا دریا تھا۔ یہ ان کے لہو کی طوفانی ندی تھی۔ جو اپنی اُمنڈتی ہوئی لہروں کو لئے ہوئے اٹھی اور سامراجی قوتوں کو خس وخاک کی طرح بہا لے گئی۔ پنجاب نے سارے ملک کے لیے اپنے خون کی قربانی دی تھی۔ اور اس وسیع آسمان تلے کسی نے آج تک مختلف تہذیبوں، مختلف مذہبوں اور مختلف مزاجوں کو ایک ہی جذبے کی خاطر یوں مدغم ہوتے نہ دیکھا تھا۔

جذبہ شہیدوں کے خون سے استوار ہو گیا تھا۔ اس میں رنگ آ گیا تھا۔ جو رعنائی

اور تخلیق کی چمک سے جگمگا اٹھا........ آزادی..... آزادی..... آزادی....

صدیق کڑہ فتح خاں میں رہتا تھا۔ کڑہ فتح خاں میں اوم پرکاش بھی رہتا تھا۔ جو امرتسر کے ایک مشہور بیوپاری کا بیٹا تھا۔ صدیق اُسے اور اوم پرکاش صدیق کو بچپن سے جانتا تھا۔ وہ دونوں دوست نہ تھے۔ کیونکہ صدیق کا باپ کچا چمڑہ بیچتا تھا۔ اور غریب تھا اور اُوم پرکاش کا باپ بنکر تھا اور امیر تھا۔ لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ دونوں ہمسائے تھے اور آج دونوں جلیانوالا باغ میں اکٹھے ہو کر ایک ہی جگہ پر اپنے رہنماؤں کے خیالات اور ان کے تاثرات کو اپنے دل میں جگہ دے رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ یوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ لیتے اور یوں مسکرا اٹھتے۔ جیسے وہ سدا سے بچپن کے ساتھی اور ایک دوسرے کا بھید جانتے ہیں۔

دل کی بات نگاہوں میں نتھر آئی تھی۔ آزادی........ آزادی.....

آزادی.......

اور جب گولی چلی تو پہلے اوم پرکاش کو لگی۔ کندھے کے پاس اور وہ زمین پر گر گیا۔ صدیق اس کو دیکھنے کے لیے جھکا تو گولی اس کی ٹانگ کو چھیدتی ہوئی پار ہو گئی۔ پھر دوسری گولی۔ پھر تیسری۔

پھر جیسے بارش ہوتی ہے۔ بس اسی طرح گولیاں برسنے لگیں اور خون بہنے لگا اور سکھوں کا خون مسلمانوں میں، اور مسلمانوں کا ہندؤں میں مدغم ہو گیا۔

ایک ہی گولی تھی۔ ایک ہی قوت تھی، ایک ہی نگاہ تھی جو سب دلوں کو چھیدتی چلی جا رہی تھی۔ صدیق اوم پرکاش پر اور بھی جھک گیا۔ اس نے اپنے جسم کو اوم پرکاش کے لیے ڈھال بنا لیا اور پھر وہ اور اوم پرکاش دونوں گولیوں کی بارش میں گھٹنوں

کے بل گھسٹتے گھسٹتے اس دیوار کے پاس پہنچے جو اتنی اونچی نہ تھی کہ کوئی پھلانگ نہ سکتا لیکن اتنی نیچی بھی نہ تھی کہ اسے پھلانگتے ہوئے کسی سپاہی کی گولی کا خطرناک نشانہ بننا زیادہ مشکل نہ تھا۔

صدیق نے اپنے آپ کو دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ اور جانور کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں زمین پر ٹیک کر کہا۔

"لو پرکاش خدا کا نام لے کر دیوار پھلانگ جاؤ۔"

گولیاں برس رہی تھیں۔

پرکاش نے بڑی مشکل سے صدیق کی پیٹھ کا سہارا لیا اور پھر اونچا ہو کر اس نے دیوار کو پھلانگنے کی کوشش کی۔

ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی۔

"جلدی کرو۔" صدیق نے نیچے سے کہا۔

لیکن اس سے پہلے پرکاش دوسری طرف جا چکا تھا۔ صدیق نے اس طرح اکڑوں رہ کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر یک لخت سیدھے ہو کر جو ایک جست لگائی تو دیوار کی دوسری طرف، لیکن دوسری طرف جاتے جاتے سنسناتی ہوئی گولی اس کی دوسری ٹانگ کے پار ہو گئی۔

صدیق پرکاش کے اوپر جا گرا۔ پھر جلدی سے الگ ہو کر اُسے اٹھانے لگا۔

"تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی پرکاش؟"

لیکن پرکاش مرا پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہیرے کی انگوٹھی ابھی زندہ تھی۔ اس کی جیب میں دو ہزار کے نوٹ کلبلا رہے تھے اس کا گرم خون ابھی زمین

کو سیراب کئے جارہا تھا۔ حرکت تھی۔ زندگی تھی۔ اضطراب تھا۔ لیکن وہ خود مرچکا تھا۔

صدیق نے اُسے اٹھایا اور اُسے گھر لے چلا اس کی دونوں ٹانگوں میں درد شدت کا تھا۔ لہو بہہ رہا تھا۔ ہیرے کی انگوٹھی نے بہت کچھ کہا سُنا۔ لوگوں نے بہتیرا سمجھایا۔ وہ تہذیب جو مختلف تھی۔ وہ مذہب جو الگ تھا۔ وہ سماج جو بے گانہ تھا۔

اس نے طنز و تشنیع سے بھی کام لیا۔ لیکن صدیق نے کسی کی نہ سُنی اس نے اپنے بہتے ہوئے لہو اور اپنی نکلتی ہوئی زندگی کی فریاد بھی نہ سُنی اور اپنے رستے پر چلا گیا۔ یہ راستہ بالکل نیا تھا۔ گو کٹڑہ فتح خاں ہی کو جاتا تھا۔ آج فرشتے اس کے ہمراہ تھے۔ گو وہ ایک کافر کو اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے تھا۔ آج اس کی روح اس قدر امیر تھی کہ کٹڑہ فتح خاں پہنچ کر اس نے سب سے کہا۔

یہ لو ہیرے کی انگوٹھی اور یہ لو دو ہزار کے نوٹ اور یہ ہے شہید کی لاش۔ اتنا کہہ کر صدیق بھی وہیں گر گیا۔ اور شہر والوں نے دونوں کا جنازہ اس دھوم دھام سے اٹھایا گویا وہ سگے بھائی تھے۔

ابھی کرفیو نہ ہوا تھا۔ کوچہ رام داس کی دو مسلمان عورتیں، ایک سکھ عورت اور ایک ہندو عورت سبزی خریدنے نکلیں یا وہ مقدس گردوارے کے سامنے

سے گزریں۔ ہر ایک نے تعظیم دی اور پھر منہ پھیر کر سبزی خریدنے میں مصروف ہوگئیں۔ انہیں بہت جلد لوٹنا تھا۔

کرفیو ہونے والا تھا۔ اور فضا میں شہیدوں کے خون کی گونج پکار رہی تھی۔ پھر بھی باتیں کرتے اور سودا خریدتے انہیں دیر ہوگئی اور جب واپس چلنے لگیں تو کرفیو میں چند منٹ ہی باقی تھے۔

بیگم نے کہا۔ آؤ۔ اس گلی سے نکل چلیں۔ وقت سے پہنچ جائیں گی۔

پارو نے کہا۔

پر وہاں تو پہرہ ہے گوروں کا۔

شاہ کور بولی۔

اور گوروں کا کوئی بھروسہ نہیں۔

زینب نے کہا۔ وہ عورتوں کو کچھ نہ کہیں گے۔ ہم گھونگھٹ کاڑھے نکل جائیں گی۔ جلدی کرو۔

وہ پانچوں دوسری گلی سے ہولیں۔ فوجیوں نے کہا۔ اس جھنڈے کو سلام کرو۔ یہ یونین جیک ہے۔

عورتوں نے گھبرا کر اور بوکھلا کر سلام کر دیا۔

اب یہاں سے وہاں تک ــــ فوجی نے گلی کی لمبائی بتاتے ہوئے کہا۔

گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی یہاں سے فی الفور نکل جاؤ۔

گھٹنوں کے بل! یہ تو ہم سے نہ ہوگا۔ زینب نے چمک کر کہا۔

او جھک کر چلو...... سرکار کا حکم ہے گھٹنوں کے بل گھسٹ کر چلو۔

ہم تو یوں جائیں گی۔ شام کور نے تن کر کہا۔ دیکھیں کون روکتا ہے ہمیں۔

یہ کہہ کر وہ چلی۔

ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ پارو نے ڈر کر کہا۔

ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ گورے نے کہا۔ ہم گولی مارے گا۔

شام کور سیدھی جا رہی تھی۔

ٹھائیں۔

شام کور گر گئی۔

زینب اور بیگم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور پھر وہ دونوں گھٹنوں کے بل گر گئیں۔ گورا خوش ہو گیا۔ اس نے سمجھا۔ سرکار کا حکم بجا لا رہی ہیں۔

زینب اور بیگم نے گھٹنوں کے بل گر کے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور چند لمحوں کے سکوت کے بعد وہ دونوں سیدھی کھڑی ہو گئیں اور گلی کو پار کرنے لگیں۔

گورا بھونچکا رہ گیا۔ پھر غصے سے اس کے گال تمتما اٹھے اور اس نے رائفل سیدھی کی۔

ٹھائیں۔ ٹھائیں!

پارو رونے لگی۔ اب مجھے بھی مرنا ہو گا۔ یہ کیا مصیبت ہے۔ میرے پتی دیو۔ میرے بچو۔ میری ماں جی۔ میرے پتا جی۔ میرے دیرو۔

آج مجھے بھی مرنا ہے۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔ پھر مجھے بھی مرنا ہوگا۔ میں اپنی بہنوں کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔

پارو روتے روتے بڑھی۔

گورے نے اُسے نرمی سے سمجھایا۔

"رونے کی ضرورت نہیں۔ سرکار کا حکم مانو اور اس گلی سے گھٹنوں کے بل گر کر چلتی جاؤ۔ پھر تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔"

گورے نے خود گھٹنے ٹیک کر اُسے چلنے کا انداز سمجھایا۔

پارو روتے روتے گورے کے قریب آئی۔ گورا اب سیدھا تن کر کھڑا تھا۔ پارو نے زور سے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اور پھر پلٹ کر گلی کو پار کرنے لگی۔ وہ گلی کے بیچوں بیچ سیدھی تن کر چلی جا رہی تھی اور گورا اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے اپنی بندوق سیدھی کی اور پارو جو اپنی سہیلیوں میں سب سے زیادہ کمزور اور بزدل تھی۔ سب سے آگے جا کر مر گئی۔

پارو۔ زینب۔ بیگم۔ شام کور۔

گھر کی عورتیں، پردے دار خواتین۔ عفت مآب بی بیاں۔ اپنے سینوں میں اپنے خاوند کا پیار۔ اپنے بچوں کی ممتا کا دودھ لئے ظلم کی اندھیری گلی سے گزر گئیں۔ ان کے جسم گولیوں سے چھلنی ہو گئے۔ لیکن ان کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ اس وقت کسی کی محبت نے پکارا۔

لیکن ان کی روحوں نے کہا۔ نہیں آج تمہیں جھکنا نہیں ہے۔ آج صدیوں کے بعد وہ لمحہ آیا ہے۔ جب سارا ہندوستان جاگ اٹھا ہے اور سیدھا تن کر

اس گلی سے گزر رہا ہے۔ سر اٹھائے آگے بڑھ رہا ہے۔ زینب، بیگم، پارو، شام کور۔ کس نے کہا اس ملک سے سیتا مر گئی۔ کس نے کہا اب اس دیس میں ستی ساوتری پیدا نہیں ہوتی؟...... آج اس گلی کا ذرہ ذرہ کسی کے قدوسی لہو سے روشن ہے۔ شام کور، زینب، پارو، بیگم آج خود تم خود اس گلی سے سر اونچا کرکے نہیں گزر رہی ہو۔ آج تمہارا دیس، فخر سے سر اٹھائے اس گلی سے گزر رہا ہے۔ آج آزادی کا اونچا جھنڈا اس گلی سے گزر رہا ہے۔ آج تمہارا دیس تمہاری تہذیب، تمہارے مذہب کی قابل احترام روایتیں زندہ ہو گئی ہیں۔ آج انسانیت کا سر غرور سے بلند ہے تمہاری روحوں پر ہزاروں لاکھوں سلام!......

امرتسر آزادی کے بعد

پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا۔ پاکستان آزاد ہوا۔ پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان بھر میں جشن آزادی منایا جا رہا تھا۔ اور کراچی میں آزاد پاکستان کے فرحت ناک نعرے بلند ہو رہے تھے۔ پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو لاہور جل رہا تھا اور امرتسر میں ہندو مسلم سکھ عوام، فرقہ وارانہ فساد کی ہولناک لپیٹ میں آ چکے تھے۔ کیونکہ کسی نے پنجاب کے عوام سے نہیں پوچھا تھا کہ تم الگ رہنا

چاہتے ہو یا مل جل کے، جیسا تم صدیوں سے رہتے چلے آئے ہو۔ صدیوں پہلے مطلق العنانی کا دور دورہ تھا۔ اور کسی نے کبھی نہ پوچھا تھا۔ پھر انگریزوں نے اپنے مزاج اپنے سامراج کی بنیاد ڈالی اور انہوں نے پنجاب سے سپاہی اور گھوڑے اپنی فوج میں بھرتی کئے اور اس کے عوض پنجاب کو نہریں عطا فرمائیں۔ لیکن انہوں نے بھی پنجابی عوام سے سب کچھ پوچھ کے تھوڑی کیا تھا۔

اس کے بعد سیاسی شعور آیا۔ سیاسی شعور کے ساتھ جمہوریت آئی اور جمہوریت کے ساتھ جمہوری سیاست داں آئے اور سیاسی جماعتیں آئیں۔ لیکن فیصلہ کرتے وقت انہوں نے بھی پنجابی عوام سے کچھ نہ پوچھا۔ ایک نقشہ سامنے رکھ کر پنجاب کی سرزمین کو نوکِ قلم سے دو ٹکڑے کر دیئے۔

فیصلہ کرنے والے سیاستداں گجراتی تھے۔ کشمیری تھے۔ اس لئے پنجاب کے نقشے کو سامنے رکھ کے اس پر قلم سے ایک لکیر۔ ایک حدِ فاصل قائم کر دینا ان کے لیے زیادہ مشکل نہ تھا۔ نقشہ ایک نہایت ہی معمولی سی چیز ہے آٹھ آنے روپے میں پنجاب کا نقشہ ملتا ہے۔ اس پر لکیر کھینچ دینا بھی آسان ہے۔ ایک کاغذ کا ٹکڑا! ایک روشنائی کی لکیر، وہ کیسے پنجاب کے دکھ کو سمجھ سکتے تھے۔

اس لکیر کی ماہیت کو جو اس نقشے کو نہیں پنجاب کے دل کو چیرتی چلی جا رہی تھی پنجاب کے تین مذہب تھے۔ لیکن اُس کا دل ایک تھا۔ اس کا لباس ایک تھا۔ اس کی زبان ایک تھی۔ اس کے گیت ایک تھے۔ اس کے کھیت ایک تھے۔ اس کے کھیتوں کی رومانی فضا اور اس کے کسانوں کے پنچایتی ولولے ایک تھے۔ پنجاب میں وہ سب باتیں موجود تھیں۔ جو ایک تہذیب، ایک دیس۔ ایک قومیت کے

وتبو: کا احاطہ کرتی ہیں۔ پھر کس لئے اس کے گلے پر چھری چلائی گئی۔ کس لئے اس کے کھلیانوں کو شیطنیت اور ظلم اور مذہبی بہیمیت کی آگ سے جلایا گیا؟ ہمیں معلوم نہ تھا۔ ہمیں افسوس ہے۔ ہم اس ظلم کی مذمت کرتے ہیں۔"

ظلم اور نفرت اور مذہبی جنون کو بھڑکانے والے، پنجاب کی وحدت کو مٹا دینے والے۔ پنجاب کی وحدت کو مٹا دینے والے آج مگرمچھ کے آنسو بہا رہے ہیں، اور آج پنجاب کے بیٹے دلی کی گلیوں میں اور کراچی کے بازاروں میں بھیک مانگ رہے ہیں اور ان کی عورتوں کی عصمت لٹ چکی ہے اور ان کے کھیت ویران پڑے ہیں کہا جاتا ہے، کہ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں نے پنجابی پناہ گزینوں کے لیے بیس کروڑ روپے یعنی فی کس بیس روپے دے کر بڑا احسان کیا ہے ہماری سات پشتوں پر۔ ارے ہم تو مہینے میں بیس روپے کی لسّی پی جاتے ہیں اور آج تم ان لوگوں کو خیرات دینے چلے ہو جو کل تک ہندوستان کے سب کسانوں میں سب سے زیادہ خوشحال تھے۔

جمہوریت کے پرستارو، ذرا پنجاب کے کسانوں سے اس کے طالب علموں سے اس کے کھیت کے مزدوروں سے۔ اس کے دکانداروں سے، اس کی ماؤں، بیٹیوں، بہوؤں سے پوچھ تو لیا ہوتا کہ اس نقشے پر جو یہ کالی لکیر لگ رہی ہے اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ مگر وہاں فکر کس کو ہوتا۔ کسی کا اپنا دیس ہوتا، کسی کا اپنا وطن ہوتا۔ کسی کی اپنی زبان ہوتی کسی کے اپنے گیت ہوتے تو وہ سمجھ سکتا کہ یہ غلطی ہے اور اس کا خمیازہ کیسے بھگتنا پڑے گا۔ یہ دُکھ وہی سمجھ سکتا ہے جو ہیر کو رانجھے سے جدا ہوتے ہوئے دیکھے جو سوہنی کو مہینوال کے فراق میں تڑپتا دیکھے۔ جس نے پنجاب کے کھیتوں میں اپنے ہاتھوں سے گیہوں کی سبز بالیاں اگائی ہوں، اور اس کے کپاس کے ننھے چاندوں جیسے پھولوں

کو چمکتا ہوا دیکھا ہو۔ یہ سیاستدان کیا سمجھتے ہیں اس دُکھ کو۔ جمہوریت کے سیاست دان تھے نا؟

خیر رونا مرنا ہوتا رہتا ہے۔ انسان کو ابھی انسان ہونے میں بہت دیر ہے پھر ایک ہیچمدان فسانہ نگار کو ان باتوں سے کیا۔ اُسے زندگی سے، سیاست سے، علم و فن سے، سائنس سے تاریخ و فلسفے سے کیا لگاؤ اُسے کیا غرض کہ پنجاب مرتا ہے یا جیتا ہے عورتوں کی عصمتیں برباد ہوئی ہیں۔ یا محفوظ رہتی ہیں۔

بچوں کے گلے پر چھری پھیری جاتی ہے۔ یا اُن پر مہربان ہونٹوں کے بوسے ثبت ہوتے ہیں۔ اُسے سب باتوں سے الگ ہو کر اپنی کہانی سنانی چاہیئے۔ اپنی چھوٹی موٹی کہانی جو لوگوں کے دلوں کو خوش کر سکے۔ یہ بڑے بول اُسے زیب نہیں دیتے۔

ٹھیک تو کہتے ہیں آپ، اس لئے اب امرتسر کی آزادی کی کہانی سنئے اس شہر کی کہانی جہاں جلیان والا باغ ہے۔ جہاں شمالی ہند کی سب سے بڑی تجارتی منڈی ہے۔

جہاں سکھوں کا سب سے بڑا، مقدس ترین گردوارہ ہے۔ جہاں کی قومی تحریکوں میں مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ کہا جاتا تھا کہ لاہور اگر فرقے داری کا قلعہ ہے تو امرتسر قومیت کا مرکز ہے۔ اسی قومیت کے بڑے مرکز کی داستان سنئے:

پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو امرتسر آزاد ہوا۔ پڑوس میں لاہور جل رہا تھا۔ مگر امرتسر آزاد تھا۔ اور اس کے مکانوں، بازاروں اور دکانوں پر ترنگے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ امرتسر کے قوم پرست مسلمان اِس جشنِ آزادی میں سب سے آگے تھے۔ کیونکہ وہ آزادی کی تحریک

میں سب سے آگے رہے تھے۔

یہ امرتسر اکالی تحریک کا امرتسر نہ تھا۔ یہ احراری تحریک کا بھی امرتسر نہ تھا۔ یہ ڈاکٹر سیتہ پال کا امرتسر نہ تھا۔ یہ کچلو اور حسام الدین کا امرتسر نہ تھا۔ اور آج امرتسر آزاد تھا۔ اور اس کی قوم پرور فضا میں آزاد ہندوستان کے نعرے گونج رہے تھے۔ اور امرتسر کے مسلمان، ہندو اور سکھ یک جا خوش تھے۔

جلیان والا باغ کے شہید زندہ ہو گئے تھے۔

شام کو جب اسٹیشن پر چراغاں ہوا۔ تو آزاد ہندوستان اور آزاد پاکستان سے دو اسپیشل گاڑیاں آئیں۔

پاکستان سے آنے والی گاڑی میں ہندو اور سکھ لوگ تھے۔ ہندوستان سے جانے والی گاڑی میں مسلمان تھے۔ تین چار ہزار افراد اس گاڑی میں اور اتنے ہی دوسری گاڑی میں، کل چھ سات ہزار افراد میں بہ مشکل دو ہزار زندہ ہوں گے۔ باقی لوگ مرے پڑے تھے۔ اور ان کی لاشیں سر بریدہ تھیں۔ اور ان کے سر نیزوں پہ لگا کے گاڑیوں کی کھڑکیوں میں سجائے گئے تھے۔

پاکستان اسپیشل پر اردو کے موٹے موٹے حروف میں لکھا ہوا تھا۔ قتل کرنا پاکستان سے سیکھو۔ ہندوستان اسپیشل پہ ہندی میں لکھا تھا "بدلہ لینا ہندوستان سے سیکھو" اس پر ہندوؤں اور سکھوں کو بڑا طیش آیا۔ "ظالموں نے ہمارے بھائیوں کے ساتھ کتنا برا سلوک کیا۔ ہائے یہ ہمارے ہندو اور سکھ پناہ گزین اور واقعی ان کی حالت بھی قابلِ رحم تھی۔

انہیں فوراً گاڑی سے نکال کر پناہ گزینوں کے کیمپ میں پہنچا یا گیا۔ اور سکھوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی گاڑی پر دھاوا بول دیا۔ یعنی اگر نہتے اور نیم مردہ مہاجرین پر حملہ کرنے

کو " دھا وا " کہہ سکتے ہیں ، تو وا قعی دھا وا تھا ۔ آدھے سے زیادہ لوگ مار ڈالے گئے جب کہیں جا کر ملٹری نے " حالات " پر قابو پایا ۔

گاڑی میں ایک بوڑھی عورت بیٹھی تھی ۔ اور اس کی گود میں اس کا ننھا پوتا تھا ۔ راستے میں اس کا بیٹا مارا گیا تھا ۔ اس کی بہو کو جاٹ اٹھا کر لے گئے تھے ۔ اس کے خاوند کو لوگوں نے بھالوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا ۔

اب وہ چُپ چاپ بیٹھی تھی ۔ اس کے لبوں پر آہیں نہ تھیں ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے ۔ اس کے دل میں دُعا نہ تھی ، اس کے ایمان میں قوت نہ تھی ۔ وہ پتھر کا بُت بنی چُپ چاپ بیٹھی تھی ۔ جیسے وہ کچھ سن نہ سکتی تھی کچھ دیکھ نہ سکتی تھی ۔ کچھ محسوس نہ کر سکتی تھی ۔

بچے نے کہا " دادی اماں پانی "

دادی چُپ رہی ۔

بچہ چیخا " دادی اماں پانی "

دادی نے کہا ۔

" بیٹا پاکستان آئے گا تو پانی ملے گا "

بچے نے کہا " دادی اماں ! کیا ہندوستان میں پانی نہیں ہے ؟ "

دادی نے کہا ۔

" بیٹا اب ہمارے دیس میں پانی نہیں ہے ؟ "

بچے نے کہا " کیوں نہیں ہے ؟ مجھے پیاس لگی ہے میں تو پانی پیوں گا ۔ پانی ، پانی ، پانی ۔ دادی اماں پانی پیوں گا ۔ میں پانی پیوں گا "

"پانی پیو گے ؟
ایک اکالی رضاکار وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس نے خشمگیں نگاہوں سے بچے کی طرف دیکھ کر کہا۔
"پانی پیو گے نا ؟"
" ہاں "۔ بچے نے سر ہلایا۔
" نہیں نہیں "۔ دادی نے خوفزدہ ہو کر کہا۔
" یہ کچھ نہیں کہتا آپ کو۔ یہ کچھ نہیں مانگتا آپ سے۔ خدا کے لیے سردار صاحب اسے چھوڑ دیجیے، میرے پاس اب اور کچھ نہیں ہے "۔
اکالی رضاکار ہنسا۔ اس نے پائیدان سے رستے ہوئے خون کو اپنی اوک میں جمع کیا اور اسے بچے کے قریب لے جاکے کہنے لگا۔
"لو! پیاس لگی ہے تو یہ پی لو۔ بڑا اچھا خون ہے۔ مسلمانوں کا خون ہے "۔
دادی پیچھے ہٹ گئی۔ بچہ رونے لگا۔
دادی نے اپنے بچے کو میلے دوپٹے سے ڈھک لیا اور اکالی رضاکار ہنستا ہوا آگے چلا گیا۔ دادی سوچنے لگی۔ کب یہ گاڑی چلے گی۔ میرے اللہ پاکستان کب آئے گا ؟"
ایک ہندو پانی کا گلاس لے کر آیا۔
" لو پانی پلا دو اسے "۔
لڑکے نے اپنی باہیں آگے بڑھائیں۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں باہر نکلی پڑی تھیں۔ اس کے جسم کا رواں رواں پانی مانگ رہا

تھا۔

ہندو نے گلاس ذرا پیچھے سرکا لیا۔ بولا۔

"اس پانی کی قیمت ہے۔ مسلمان کے بچے کو پانی مفت نہیں ملتا۔ اس گلاس کی قیمت پچاس روپے ہے۔"

"پچاس روپے؟"

دادی نے عاجزی سے کہا۔

"بیٹا میرے پاس تو چاندی کا ایک چھلا بھی نہیں ہے۔ میں پچاس روپے کہاں سے دوں گی۔"

"پانی پانی تو پانی مجھے دو۔ پانی کا گلاس مجھے دے دو۔" دادی اماں دیکھو۔ یہ ہمیں پانی نہیں دیتا!"

"مجھے دو مجھے دو۔"

ایک دوسرے مسافر نے کہا۔

"یہ لو میرے پاس پچاس روپے ہیں۔"

ہندو ہنسنے لگا۔

"یہ پچاس روپے تو بچے کے لیے تھے۔ تمہارے لئے اس گلاس کی قیمت سو روپیہ ہے۔ سو روپے دو اور پانی کا گلاس پی لو۔"

"اچھا یہ سو روپے ہی لے لو۔ یہ لو۔"

دوسرے مسلمان مسافر نے سو روپیہ ادا کر کے گلاس لے لیا۔ اور اُسے غٹا غٹ پینے لگا۔

بچہ اُسے دیکھ کر اور بھی چلاّنے لگا۔" پانی۔ پانی۔ پانی۔ دادی امّاں پانی۔"

"ایک گھونٹ اسے بھی دے دو۔ خدا اور رسول کے لیے۔"

مسلمان کافر نے گلاس خالی کر کے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جاگرا۔ اور پانی کی چند بوندیں فرش پر بکھر گئیں۔

بچہ گود سے اُتر کر فرش پر چلا گیا۔ پہلے تو اس نے گلاس کو چاٹنے کی کوشش کی۔ پھر فرش پر گری ہوئی چند بوندوں کو۔ پھر زور زور سے چلاّنے لگا۔ پانی۔ دادی اماں پانی۔ پانی۔"

پانی موجود تھا اور پانی نہیں تھا۔ ہندو پناہ گزین پانی پی رہے تھے اور مسلمان پناہ گزین پیاسے تھے۔

پانی موجود تھا اور مشکوں کی قطاریں سٹیشن کے پلیٹ فارم پر سجی ہوئی تھیں۔ اور پانی کے نل کھلے تھے اور بھنگی آبدست...... لئے پانی ہندو مسافروں کو دے رہے تھے۔ لیکن پانی نہیں تھا۔ تو مسلمان مہاجرین کے لیے کیونکہ پنجاب کے نقشے پر ایک کالی موت کی لکیر کھینچ گئی تھی۔

اور کل کا بھائی آج کا دشمن ہوگیا۔ اور کل جس کو ہم نے بہن کہا تھا۔ آج وہ ہمارے لئے طوائف سے بھی بدتر تھی۔ اور کل جو ماں تھی آج بیٹے نے اُسے ڈائن سمجھ کر اس کے گلے پر چھری پھیر دی تھی۔ پانی ہندوستان میں تھا۔ اور پانی پاکستان میں بھی تھا۔ اور یہ دونوں ملک نفرت کے صحرا بن گئے تھے۔ اور ان کی تپتی ہوئی ریت پر چلتے ہوئے کارواں بادِ سموم کی بربادیوں کے شکار ہو گئے تھے۔

پانی تھا۔ مگر سراب تھا۔ جس دیس میں لسی اور دودھ پانی کی طرح بہتے تھے وہاں آج پانی نہیں تھا اور اس کے بیٹے پیاس سے بلک بلک کر مر رہے تھے۔

کیونکہ پانی تھا اور نہیں تھا۔ پنجاب کے پانچوں دریا بہہ رہے تھے لیکن دل کے دریا سوکھ گئے تھے۔ اس لئے پانی تھا اور نہیں تھا۔

پھر آزادی کی رات آئی۔ دیوالی پر بھی ایسا چراغاں نہیں ہوتا۔ کیونکہ دیوالی پر تو صرف دیئے جلتے ہیں یہاں گھروں کے گھر جل رہے تھے۔

دیوالی پر آتشبازی ہوتی ہے پٹاخے چھوٹتے ہیں۔ یہاں بمب پھٹ رہے تھے اور مشین گنیں چل رہی تھیں۔

انگریزوں کے راج میں ایک پستول بھی مولے سے نہیں ملتا تھا اور آزادی کی پہلی ہی رات نجانے کہاں سے یہ اتنے سارے بمب، ہینڈ گرینیڈ۔ مشین گن۔ اسٹین گن۔ برین گن ٹپک پڑے۔

یہ اسلحہ جات برطانوی اور امریکی کمپنیوں کے بنائے ہوئے تھے۔ اور آج آزادی کی رات ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے دل چھید رہے تھے۔

لڑے جاؤ بہادرو، مرے جاؤ بہادرو! ہم اسلحہ جات تیار کریں گے تم لڑو گے۔ شاباش بہادرو۔ دیکھنا کہیں ہمارے گولے بارود کے کارخانوں کا

منافع کم نہ ہو جائے۔

گھمسان کا رَن رہے تو مزا ہے۔ چین والے لڑتے ہیں تو ہندوستان اور پاکستان والے کیوں نہ لڑیں ؟

وہ بھی ایشیائی ہیں تم بھی ایشیائی ہو۔ ایشیا کی عزت برقرار رکھو۔ لڑتے جاؤ بہادرو، تم نے لڑنا بند کر دیا تو ایشیا کا رُخ دوسری طرف پلٹ جائے گا۔ اور پھر ہمارے کارخانوں کے منافعے اور حصے اور ہماری سامراجی خوشحالی خطرے میں پڑ جائے گی۔

لڑے جاؤ بہادرو۔ پہلے تم ہمارے ملکوں سے کپڑا اور شیشے کا سامان اور عطریات منگاتے تھے۔ اب ہم تمہیں اسلحہ جات بھیجیں گے اور بم اور ہوائی جہاز اور کارتوس، کیونکہ اب تم آزاد ہو گئے ہو۔

مسلح ہندو اور سکھ رضاکار، مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا رہے تھے اور جے ہند کے نعرے گونج رہے تھے۔ مسلمان اپنے گھروں کی کمین گاہوں میں چھُپ کر حملہ آوروں پر مشین گنوں سے حملہ کر رہے تھے اور ہینڈ گرینیڈ پھینکتے تھے۔

آزادی کی رات اور اس کے تین چار روز بعد تک اس طرح مقابلہ رہا۔ پھر سکھوں اور ہندوؤں کی مدد کے لیے آس پاس کی ریاستوں سے رضاکار پہنچ گئے۔ اور مسلمانوں نے اپنے گھر خالی کرنے شروع کئے۔

گھر، محلے بازار جل رہے تھے۔ ہندوؤں کے گھر اور مسلمانوں کے گھر اور سکھوں کے گھر۔ لیکن آخر مسلمانوں کے گھر سب سے زیادہ جلے۔ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان اکٹھے ہو کر شہر سے بھاگنے لگے۔ اس موقع پر جو کچھ ہوا اُسے

تاریخ میں "امرتسر کا قتلِ عام" کہا جائیگا۔

لیکن ملٹری نے "حالات" پر جلد قابو پا لیا۔ قتلِ عام بند ہوا۔ اور ہندو اور مسلمان دو مختلف کیمپوں میں بند ہو کر پناہ گزین کہلانے لگے۔

ہندو پناہ گزین "شرنارتھی" کہلاتے تھے اور مسلمان پناہ گزین "مہاجرین"، گو مصیبت دونوں پر ہی ایک تھی۔ لیکن ان کے نام الگ الگ کر دیئے گئے تھے تاکہ مصیبت میں یہ لوگ اکٹھے نہ ملیں۔

دونوں کیمپوں پر نہ چھت نہ روشنی کا انتظام تھا۔ نہ سونے کے لیے بستر تھے۔ نہ پاخانے، لیکن ایک کیمپ ہندو اور سکھ شرنارتھیوں کا کیمپ کہلاتا تھا۔ دوسرا مسلمان مہاجرین کا۔

ہندو شرنارتھیوں کے کیمپ میں آزادی کی رات شدید بخار میں لرزتی ہوئی ایک ماں اپنے بیٹے کے سامنے دم توڑ رہی تھی۔ یہ لوگ مغربی پنجاب سے آئے تھے پندرہ آدمیوں کا خاندان تھا۔ پاکستان سے آتے آتے صرف دو افراد رہ گئے تھے۔ اور ان میں سے بھی ایک بیمار تھا۔ دوسرا دم توڑ رہا تھا۔ جب یہ پندرہ افراد کا قافلہ گھر سے چلا تھا تو ان کے پاس بستر تھا۔ سامان خورد و نوش تھے۔ کپڑوں سے بھرے ٹرنک تھے۔ روپیہ کی پوٹلیاں تھیں۔ عورتوں کے جسموں پر زیور تھے اور لڑکے کے پاس ایک بائیسکل تھی۔ اور یہ سب آدمی تھے۔ اور یہ سب پندرہ آدمی تھے۔

گوجرانوالہ تک پہنچتے پہنچتے دس آدمی رہ گئے۔ پہلے روپیہ گیا۔ پھر زیور۔ پھر عورتوں کے جسم۔

لاہور آتے آتے چھ آدمی رہ گئے۔ کپڑوں کے ٹرنک گئے اور بستر بھی۔ لڑکے کو اپنی بائیسکل چھن جانے کا بڑا افسوس تھا۔

اور جب مغلپورہ سے آگے بڑھے تو صرف دو رہ گئے تھے۔ ماں اور ایک بیٹا اور ایک لحاف جو دم توڑتی ہوں عورت لرزنے کے بخار میں اس وقت اوڑھے ہوئی تھی۔ اسی وقت، آدھی رات کے وقت، آزادی کی پہلی رات کو وہ عورت مر رہی تھی اور اس کا بیٹا چپ چاپ اس کے سرہانے بیٹھا ہوا کانپ رہا تھا۔ اس کی ٹکٹکی بندھی ہوئی تھی اور آنسو ایک مدت ہوئی ختم ہو چکے تھے۔

اور جب اس کی ماں مر گئی۔ تو اس نے آہستہ سے لحاف کو اس کے جسم سے الگ کیا اور اُسے اوڑھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا

تھوڑی دیر بعد ایک رضا کار اس کے پاس آیا۔ اور اس سے اسکی ماں کی لاش کے متعلق پوچھنے لگا۔

"نہیں نہیں مجھے کچھ معلوم نہیں وہ کون تھی"

لڑکے نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

اور زور سے لحاف اپنے گرد لپیٹتے ہوئے بولا۔

"وہ میری ماں نہیں تھی۔ یہ لحاف میرا ہے" وہ زور زور سے چیخنے لگا۔

"وہ میری ماں نہیں تھی۔ یہ لحاف میرا ہے میں اسے کسی کو نہ دوں گا۔ یہ لحاف میں ساتھ لایا ہوں نہیں دوں گا نہیں!"

ایک لحاف، ایک ماں، ایک مردہ انسانیت۔ کسے معلوم تھا کہ ایک دن اس نئی تثلیث کی کہانی بھی مجھے آپ کو سنانی پڑے گی۔

...... جب مسلمان بھاگ گئے تو ان کے گھر لٹنے شروع ہوئے۔ شاید ہی کوئی شریف آدمی رہا ہو۔ جس نے اس لوٹ میں حصہ نہ لیا ہو۔ آزادی کے تیسرے دن کا ذکر ہے۔ میں اپنی گائے کو گلی کے باہر نل پر پانی پلانے لے جا رہا تھا۔ بالٹی میرے ہاتھ میں تھی۔ دوسرے ہاتھ میں گلے سے بندھی ہوئی رسی تھی۔

گلی کے موڑ پر پہنچ کر میں نے میونسپلٹی کے لمپ والے کھمبے سے گائے کو باندھ دیا اور نل کی جانب بالٹی لئے مڑ گیا کہ بالٹی میں پانی بھر لاؤں۔ تھوڑی دیر بعد جب بالٹی بھر کے لایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گائے غائب ہے۔ اِدھر اُدھر بہتیرا دیکھا۔ لیکن گائے کہیں نظر نہیں آئی۔ یکایک میری نگاہ ساتھ والے مکان کے آنگن میں گئی۔ دیکھتا ہوں تو آنگن میں گائے بندھی کھڑی ہے۔

میں گھر میں گھسا۔

"کیا ہے بھئی۔ کون ہو تم؟" ایک سردار صاحب نے نہایت خشونت سے کہا۔

میں نے کہا۔

"میں اپنی گائے کو ابھی اس کھمبے سے باندھ کر نل پہ پانی لانے گیا تھا۔ یہ گائے تو میری ہے سردار جی!"

سردار جی مسکرائے۔

"بلا بلا کوئی گل نہیں۔ میں نے سمجھا۔ کسی مسلمان کی گائے ہے۔ یہ آپ کی گائے ہے تو پھر لے جائیے۔"

اتنا کہہ کر انہوں نے گائے کی رسی کھول کر میرے ہاتھ میں تھما دی۔

"معاف کرنا۔"

میرے چلتے چلتے انہوں نے پھر کہا۔

"آپا سمجھیا کسے مسلمان دی گاں اے۔"

میں نے یہ واقعہ اپنے دوست سردار سندر سنگھ سے بیان کیا تو وہ بہت ہنسا۔ "بھلا اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

میں نے اس سے پوچھا۔

تو وہ اور بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔ سندر سنگھ میں آپ کو بتا دوں۔ اشتراکی ہے۔ اس لئے فرقہ وارانہ عناد سے بہت دور رہتا ہے۔ وہ میرے ان چند احباب میں سے ہے۔ جنہوں نے اس لوٹ مار میں بالکل کوئی حصہ نہیں لیا۔

میں نے کہا۔ "تم اسے اچھا سمجھتے ہو؟"

وہ بولا۔

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔ میں ہنس رہا تھا۔ کیونکہ آج صبح ایک ایسا واقعہ مجھے خود پیش آیا۔ میں ہال بازار میں سے گزر رہا تھا۔ کہ میں نے سوچا سامنے کٹڑے میں سردار سوریا سنگھ جی کو دیکھتا چلوں۔ پیا نے غدر پارٹی کے لیڈر ہیں نا وہ۔

انہوں نے اپنے گاؤں میں تین چار سو مسلمانوں کو پناہ دے رکھی ہے سوچا پوچھتا ہوں ان کا کیا ہوا۔ انہیں وہاں سے نکال کر مہاجرین کے کیمپ میں لے جانے کی کیا سبیل کی جائے یہ سوچ کر میں نے اپنی گاڑی محمد رزاق جوتے والے کی دکان

(جو لُٹ چکی ہے) کے آگے کھڑی کی اور کمرے میں گھس گیا۔ چند منٹ کے بعد ہی لوٹ کر آگیا۔ کیونکہ باباجی گھر پر نہیں تھے۔ آ کے دیکھتا ہوں تو گاڑی غائب ہے۔ ابھی تو یہیں چھوڑی تھی! پوچھنے پر بھی کوئی نہیں بتاتا۔ اتنے میں میری نظر ہال بازار کے آخری کونے پر پڑی۔ وہاں میری گاڑی کھڑی تھی۔ لیکن ایک جیپ کے پیچھے بندھی ہوئی! میں بھاگا بھاگا وہاں گیا۔ جیپ میں سردار۔ سنگھ مشہور قومی کارکن بیٹھے تھے۔

میں نے پوچھا۔

"کہاں جارہے ہو؟"

"اپنے گاؤں جارہا ہوں۔"

"اور یہ موٹر بھی کیا تمہارے گاؤں جائے گی؟"

"کون سی موٹر؟ وہ جو پیچھے بندھی ہوئی ہے؟ یہ تمہاری موٹر ہے؟ معاف کرنا پیارے۔ میں نے نہیں پہچانی۔ وہ عبدالرزاق کی دکان کے سامنے کھڑی تھی نا؟"

میں نے سوچا کسی مسلمان کی ہوگی۔ میں نے اِسے جیپ کے پیچھے باندھ لیا۔

ہاہا ہا! میں تو اِسے گھر لے جارہا تھا۔ اچھا ہوا تم وقت پر آگئے۔"

"اور اب کہاں جاؤگے؟"

میں نے اپنی موٹر کھول کر اس میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اب؟ اب کہیں اور جاؤں گا۔ کہیں نہ کہیں سے کوئی مال مل ہی جائے

گا۔"

سردار سنگھ قومی کارکن ہیں۔ جیل جا چکے ہیں۔ جرمانہ ادا کر چکے ہیں۔ سیاسی آزادی کے حصول کے لیے قربانیاں دے چکے ہیں۔"

یہ واقعہ سنا کر سندر سنگھ نے کہا۔

"برائی اس حد تک پھیل چکی ہے کہ ہمارے اچھے اچھے قومی کارکن بھی اس سے محفوظ نہیں رہے۔ ہماری سیاسی جماعتوں میں کام کرنے والے طبقے کا ایک جز خود اس لوٹ مار، قتل و غارت گری میں شریک ہے۔ اس برائی کو اگر اسی وقت روکا نہ گیا۔ تو دونوں جماعتیں منطائی ہو جائیں گی۔ یہی کوئی دو چار سال ہی ہیں۔"

سندر سنگھ کا چہرہ متفکر دکھائی دے رہا تھا۔ میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا راستے میں خالصہ کالج روڈ پر ایک مسلمان امیر کی کوٹھی لوٹی جا رہی تھی۔ اسباب سے لدے ہوئے چھکڑے مختلف گروہ لے جا رہے تھے۔ میرے دیکھتے دیکھتے چند منٹوں میں سارا معاملہ ختم ہو گیا۔

سڑک پر چلنے والے ہندو اور سکھ راہ گیر بھی کوٹھی کی طرف بھاگے لیکن پولیس کے سپاہیوں کو وہاں سے نکلتے ہوئے دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔

پولیس کے سپاہیوں کے ہاتھوں میں چند جرابیں تھیں اور ریشمی ٹائیاں ایک کوٹ ہینگر پر مفلر پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے مسکرا کر لوگوں سے کہا۔

"اب کہاں جاتے ہو وہاں تو سب کچھ پہلے ہی ختم ہو چکا ہے۔

ایک مہاشے جو شکل و صورت سے آریہ سماجی معلوم ہوتے تھے اور میرے سامنے ہی کوٹھی کی طرف بھاگے تھے۔ اب مڑ کر میری طرف دیکھ کر

کہنے لگے۔

"دیکھئے صاحب۔ دنیا کیسی پاگل ہوگئی ہے"

میرے قریب ایک دودھ بیچنے والا بھیّا گزرا بلے چارے کے حصّے چند کتابیں آئی تھیں وہ انہیں اٹھائے لے جارہا تھا۔

میں نے پوچھا۔

"ان کتابوں کا کیا کروگے۔ پڑھ سکتے ہو؟"

"نا بابوجی!"

"پھر؟"

اس نے کتابوں کی طرف غصّے سے دیکھا۔ بولا۔

"ہم کیا کریں بابو! جد جاتے ہیں۔ لوگ پہلے ہی اچھا اچھا سامان اٹھا لے جاتے ہیں۔ ہماری تو کسمت کھراب (خراب) ہے بابو"

اس نے پھر کتابوں کو غصّے سے دیکھا۔ اس کا ارادہ تھا۔ انہیں یہیں سڑک پہ پھینک دے۔ پھر اس کا ارادہ بدل گیا۔ وہ مسکراکر کہنے لگا۔

"کوئی بات نہیں یہ موٹی موٹی کتابیں چولھے میں خوب جلیں گی رات کے بھوجن کے لیے لکڑیوں کی جرورت نہیں!"

بڑی اچھی کتابیں تھیں۔ سب چولھے میں گئیں۔ ارسطو۔ سقراط، افلاطون ہندسو شیکسپیئر سب چولھے میں گئے۔

سہ پہر کے قریب بازار سنسان پڑنے لگے۔ کرفیو ہونے والا تھا۔ میں

جلدی جلدی کوچہ رام داس سے نکلا۔ اور مقدس گوردوارے کو تعظیم دیتا ہوا اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا۔

راستے میں اندھیری گلی پڑتی تھی جہاں جلیان والے باغ کے روز لوگوں کو گھٹنوں کے بل چلنے پر مجبور کر دیا گیا تھا

میں نے سوچا میں اس گلی سے کیوں نہ نکل جاؤں۔ یہ راستہ ٹھیک رہے گا۔ میں اسی گلی کی طرف گھوم گیا۔

یہ گلی تنگ ہے اور یہاں دن کو بھی اندھیرا سا رہتا ہے۔ یہاں مسلمانوں کے آٹھ دس گھر ہیں۔ وہ سب جلائے گئے تھے یا لوٹے گئے تھے۔ دروازے کھلے تھے۔

کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی۔ کہیں کہیں چھتیں جلی ہوئیں۔ گلی میں سناٹا تھا۔ گلی کے فرش پر عورتوں کی لاشیں پڑی تھیں۔

میں پلٹنے لگا۔ اتنے میں کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ گلی کے بیچ میں لاشوں کے درمیان ایک بڑھیا رینگنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اُسے سہارا دیا۔

"پانی۔ بیٹا"

میں اوک میں پانی لایا۔ مقدس گردوارے کے سامنے پانی کا نل تھا۔

میں نے اپنی اوک اس کے ہونٹوں سے لگا دی۔

"تم پر خدا کی رحمت ہو بیٹا! تم کون ہو؟

خیر تم جو کوئی بھی ہو تم پر خدا کی رحمت ہو بیٹا۔ یہ ایک مرنے والی کے الفاظ

ہیں۔ انہیں یاد رکھنا۔

میں نے اُسے اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔" تمہیں کہاں کہاں چوٹ آئی ہے ماں؟"

بڑھیا نے کہا۔

"مجھے مت اٹھاؤ۔ میں نہیں مروں گی، اپنی بہو بیٹیوں کے درمیان کیا کہا تم نے چوٹ، ارے بیٹا! یہ چوٹ بہت ہی گہری ہے۔ یہ گھاؤ دل کے اندر ہے بہت گہرا گھاؤ ہے۔ تم لوگ کیسے پنپ سکو گے۔ تمہیں خدا کیسے معاف کرے گا۔؟"

"ہمیں معاف کردو ماں!"

مگر بڑھیا نے کچھ نہیں سُنا۔ وہ آپ ہی آپ کہتی جارہی تھی۔

"پہلے انہوں نے ہمارے مردوں کو مارا۔ پھر ہمارے گھر لوٹے پھر ہمیں گھسیٹ کر گلی میں لے آئے اور اس گلی میں اِس فرش پر اس مقدس گردوارے کے سامنے جسے میں ہر روز تعظیم دیا کرتی تھی۔

انہوں نے ہماری عصمت دری کی اور پھر ہمیں گولی سے مار دیا۔ میں تو کی دادیوں کی ہم عمر تھی۔ انہوں نے مجھے بھی معاف نہیں کیا۔

یکایک اس نے مجھے آستین سے پکڑ لیا۔

"تو جانتا ہے۔ یہ امرتسر ہے۔ یہ میرا شہر ہے۔ اس مقدس گردوارے کو میں روز سلام کرتی تھی۔ جیسے اپنی مسجد کو سلام کرتی ہوں۔ میری گلی میں ہندو مسلمان، سکھ سبھی بستے تھے اور کئی پشتوں سے ہم لوگ یہاں بستے چلے آئے ہیں اور

ہم ہمیشہ ہمیشہ محبت اور پیار سے صلح سے رہے اور کبھی کچھ نہیں ہوا۔"

"میرے ہم مذہبوں کو معاف کرو اماں۔"

"تو جانتا ہے میں کون ہوں؟ میں زینب کی ماں ہوں۔ تو جانتا ہے زینب کون تھی؟"

زینب وہ لڑکی تھی جس نے جلیان والے روز اس گلی میں گورے کے آگے سر نہیں جھکایا۔ جو اپنے ملک اور اپنی قوم کے لیے سر اونچا کئے اس گلی میں سے گزری۔

یہی وہ گلی ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں زینب شہید ہوئی تھی۔

میں اسی زینب کی ماں ہوں۔

میں ایسی آسانی سے تمہارا پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہوں۔

مجھے سہارا دو۔ مجھے کھڑا کر دو۔

میں اپنی لٹی ہوئی آبرو اور بہو بیٹیوں کی برباد عصمتیں لے کر سیاست دانوں کے پاس جاؤں گی۔

مجھے سہارا دو۔ میں ان سے کہونگی۔

میں زینب کی ماں ہوں۔

میں امرتسر کی ماں ہوں۔

میں پنجاب کی ماں ہوں۔

تم نے میری گود اجاڑی ہے۔

تم نے بڑھاپے میں میرا منہ کالا کیا ہے۔

میری جواں جہاں ہوؤں اور بیٹیوں کی پاک وصاف روحوں کو جہنم کی آگ میں جھونکا ہے۔

میں ان سے پوچھوں گی۔

کیا زینب اسی آزادی کے لیے قربان ہوئی تھی۔ ہیں ـــــ زینب کی ماں!!

یکایک وہ میری گود میں جھک گئی۔ اس کے منہ سے خون اُبل پڑا دوسرے لمحے اس نے جان دے دی۔

زینب کی ماں میری گود میں مری پڑی ہے اور اس کا لہو میری قمیص پر ہے۔ اور میں زندگی سے موت کے دروازے تک جھانک رہا ہوں اور تخیل میں صدیق اور ادم پر کاش ابھرتے چلے آتے ہیں اور زینب کا سرغرور فضا میں اُبھرتا چلا آتا ہے۔ اور شہید مجھ سے کہتے ہیں کہ ہم پھر آئیں گے۔

صدیق ادم پر کاش ہم پھر آئیں گے .... زینب۔ بیگم۔ پارو۔ شام کور ہم پھر آئیں گی۔

اپنی عصمتوں کا تقدس لئے ہوئے۔ اپنی بے داغ روحوں کا عزم لئے ہوئے کیونکہ ہم انسان ہیں۔ ہم اس ساری کائنات میں تخلیق کے علمبردار ہیں اور کوئی تخلیق کو مار نہیں سکتا۔ کوئی اس کی عصمت دری نہیں کر سکتا۔ کوئی اُسے لوٹ نہیں سکتا کیونکہ ہم تخلیق ہیں اور تم تخریب ہو۔ تم وحشی ہو۔ تم درندے ہو۔ تم مرجاؤ گے۔ لیکن ہم نہیں مریں گے کیونکہ انسان کبھی نہیں مرتا۔ وہ درندہ نہیں ہے۔ وہ نیکی کی روح ہے۔ خدائی کا حاصل ہے۔ کائنات کا غرور ہے۔

عورتوں کا عطر

کہانی سنانے والے نے کہا۔

"اور اس عورت کے پسینے سے بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی!"

سیٹھ موہن لال بک بیریا جو صرف کھدر پہنتے تھے۔ صرف وسکی پیتے تھے اور صرف بلیک مارکیٹ کا دھندا کرتے تھے یکایک کہانی سنتے سنتے رک گئے انھوں نے نروتم بھائی پانڈیا افسانہ نگار کو بیچ میں ٹوک دیا۔

"ابے پانڈیا۔ یہ تو نے کیا کہا؟"

جی میں نے کہا اس عورت کے پسینے سے بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔"

"کیا عورت کے پسینے سے خوشبو نکلتی ہے؟" بک بیریا نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں۔ یقین نہ ہو تو مس پر یما دتی سے پوچھ لیجئے۔"

مس پریما دتی کچھ ہنسیں کچھ شرمائیں۔ لیکن سیٹھ بک بیریا نے آگے بڑھ کر سونگھ ہی لیا۔ مس پریما دتی نے ایک ہلکی سی خوشبو لگا رکھی تھی۔ سیٹھ کے نتھنوں میں وہی ہلکی سی بے نام سی خوشبو دوڑ گئی۔

سیٹھ خوش ہو کے بولے۔

"ہاں آتی ہے۔ آتی ہے۔ لیکن سب ہی عورتوں کے پسینے سے ایسی خوشبو آتی ہے؟ سب ہی سے تو نہیں" پانڈیا سنے فلاسفروں کی طرح سمجھاتے ہوئے کہا" صرف کنواری لڑکیوں کے پسینے میں یہ بات ہوتی ہے"

مس پریا وتی کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا سیٹھ بھی بہت خوش ہوئے کیونکہ وہاں دنوں ایک فلم بنانے کی سوچ رہے تھے اور اسی سلسلے میں نروتم بھائی پانڈیا سے کہانی سن رہے تھے، اسی سلسلے میں انہوں نے مس پریا وتی کا ہیروئن کے کردار کے لیے انتخاب کیا تھا۔ نروتم بھائی پانڈیا نے کہا" سیٹھ صاحب آگے سناؤں" سیٹھ موہن لال بک بیریا نے میز کے دروازے سے ایک چیک بک نکالی اور پانچ سو روپے کا ایک چیک افسانہ نویس کو دے کر کہا۔

"تمہاری کہانی بہت اچھی ہے ایک دم زبردست لیکن باقی کہانی کل سنیں گے وہ سب ٹھیک ہو جائے گا اور کہیں کہانی نہ بھی ٹھیک ہوئی تو ہم خود ٹھیک کر لیں گے اس وقت تم جاؤ"

سیٹھ صاحب نے پریا وتی کو بھی اشارے سے کہا۔ وہ اور پانڈیا نمستے کر کے دونوں وہاں سے رخصت ہو گئے۔

سیٹھ صاحب کچھ دیر کے لیے کرسی کے اندر دھنس گئے اور کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گئے۔

رات کو سیٹھانی کھانے کا تھال سجا کے رسوئی سے باہر نکلیں اور چوکی پر تھال ٹیک کر بولیں "لو کھالو"

سیٹھانی کا لہجہ ہمیشہ سے تلخ اور تیکھا تھا، ماتھے پر ہر وقت بل رہنے سے ان کی ایک آنکھ اونچی اور ایک آنکھ نیچی دکھائی دیتی تھی۔ سیٹھ بھی سیٹھانی سے ہمیشہ اسی تلخ لہجے میں بات کرتے تھے۔ لیکن آج وہ سیٹھانی کے تیور دیکھ کر بس مسکرا دیئے۔

انہوں نے سیٹھانی کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ دراصل وہ اسے سونگھنا چاہتے تھے۔

سیٹھانی نے ماتھے سے پسینہ پونچھ کے کہا۔

"اے ہے کیا کرتے ہو کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا۔"

سیٹھ نے نتھنوں سے سوں سوں کرنے کے بعد کہا

"سیٹھانی تمہارے پسینے سے تو بدبو آتی ہے۔"

"اے ہے تمہاری عقل کو کیا ہوا ہے بڈھے ٹھڈے ہو گئے۔ اتنا معلوم نہ ہوا کہ پسینے سے بدبو نہ آئے گی تو کیا خوشبو آئے گی۔ سیٹھانی نے ذرا پرے ہٹ کے کہا۔

سیٹھ جی بولے۔

"سیٹھانی جب تم کنواری تھیں تو کیا تمہارے پسینے سے خوشبو نہیں نکلتی تھی۔" سیٹھانی بولیں۔

"لو اب کب کی باتیں کرتے ہو تم، سات سال کی تھی میں جب تم سے بیاہی گئی تھی جب سے ساری عمر رسوئی میں کاٹ دی۔ میں کیا جانوں خوشبو وشبو کو۔ اور یہ آج تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کہیں فلم کمپنی کھول کر فلم ایکٹرسیوں کے چکر میں تو نہیں آ گئے یاد رکھنا وہ جھاڑو ماروں گی کہ ......"

معاً سیٹھ نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ جلدی سے بولے "نہیں نہیں سیٹھانی کیا بات کرتی ہو میں تو یوں ہی پوچھ رہا تھا۔"

اتنا کہہ کر انہوں نے جلدی سے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن سیٹھانی نے دیکھا کہ کھانا کھاتے کھاتے کئی بار سیٹھ کا ہاتھ رک گیا۔ لقمہ ہاتھ ہی میں رہا۔ منہ تک نہیں آیا۔

سیٹھانی چلا کے بولیں۔

"کیا سوچ رہے ہو کھانا کھاتے وقت کچھ سوچا نہیں کرتے۔"

سیٹھ صاحب یکایک چونکتے ہو گئے جیسے تصور کی دنیا سے پھر سیٹھانی کی دنیا میں پہنچ گئے۔ بولے۔

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ میں تو آہستہ آہستہ ایک ایک لقمے کا مزا لے رہا ہوں۔"

"کیا لقمے کا مزا لے رہے ہو۔ وہی روز کی آلو بھاجی ہے۔" اتنا کہہ کے سیٹھانی پانی کا گلاس لانے کے لیے رسوئی کی طرف چل دیں۔

دوسرے دن مقررہ وقت پر نروتم بھائی پانڈیا۔ کہانی سنانے کے لئے سیٹھ کے دفتر میں پہنچا، وہاں سیٹھ اور مس پریا وتی پہلے ہی موجود تھے۔ پانڈیا نے اپنا چرمی بیگ کھولا۔ اس میں سے کہانی نکالی اور ابھی وہ سنانے ہی جا رہا تھا کہ سیٹھ نے اسے پھر روک دیا۔ سیٹھ نے کہا۔

"سنو پانڈیا۔ رات کو میں نے تمہاری کہانی پر بہت سوچا۔ بہت سوچا اور ایک ترکیب میرے دماغ میں آئی ہے۔"

پانڈیا اور پریما وتی دونوں ہمہ تن گوش ہو گئے۔

سیٹھ نے کہا "میں نے سوچا ہے کہ کیوں نہ تمہاری کہانی کی فلم تیار کرنے کے ساتھ ساتھ عورتوں کا عطر بھی تیار کیا جائے۔"

"عورتوں کا عطر؟"

پریما وتی حیران ہو کے پوچھنے لگی۔

"ہاں، ہاں۔"

سیٹھ موہن لال بک بیریا۔ ایک دم مسرت سے بھرپور آواز میں بولے "اگر عورتوں کے پسینے سے خوشبو نکلتی ہے تو پھر اس خوشبو سے عطر بھی تیار کیا جا سکتا ہے۔ جیسے گلاب کی پنکھڑیوں سے عطر نکلتا ہے اسی طرح عورتوں کے پسینے سے عطر تیار کروں گا۔ میں اسے تیار کرنے کے لیے ایک بہت بڑا کارخانہ کھولوں گا۔ اس پر دس کروڑ روپے صرف کروں گا اور اس میں ہزاروں لاکھوں کنواری لڑکیاں ملازم رکھوں گا۔ انہیں دن بھر دھوپ میں کھڑا رکھ کر ان کا پسینہ نکلواؤں گا اور پھر اس پسینے سے عطر کشید کیا جائے گا۔"

"اور اگر کسی دن دھوپ نہ ہوئی تو۔" پانڈیا نے سوال کیا۔

"وہ بھی میں نے سوچ لیا ہے۔" سیٹھ کی آنکھیں مسرت سے چمک رہی تھیں "میں امریکہ سے بڑے بڑے آرک لیمپ منگواؤں گا۔ جن کی گرم اور تیز روشنی ان لڑکیوں پر ڈالوں گا جو میرے کارخانے میں ملازم ہوں گی۔ پس گرمیوں کے دنوں میں انہیں اُون کی وردیاں پہناؤں گا تاکہ پسینہ خوب کھل کے مساموں سے بہہ سکے۔ برسات کی جھڑی کی طرح پسینہ پھوٹ پھوٹ کے بہے گا۔ اور جتنا زیادہ پسینہ بہے گا اتنا زیادہ عطر تیار ہو سکے گا۔ میرا کارخانہ ایک کی بجائے دو شفٹوں میں کام کرے گا۔ دن کو دھوپ کی پالی رات کو بجلی کی روشنی کی پالی اور ٹھاٹ سے کام ہوگا۔ ایک مہینے میں کم از کم ایک لڑکی سے ایک سیر عطر تیار ہو سکے گا۔ میں نے سب حساب لگا لیا ہے۔ اگر میں ایک لاکھ کنواری لڑکیوں کا کارخانہ کھولوں اور ان کے پسینے کا عطر تیار کروں تو دو سال میں میرا سرمایہ واپس آ جائے گا اور تیسرے سال مجھے کم از کم تین کروڑ کی آمدنی ہو گی۔"

"وہ کیسے۔"

پرمیلا وتی نے بھونچکا ہو کے پوچھا۔

"اشتہار بازی کے ذریعہ"، سیٹھ نے چمک کر جواب دیا۔ آج دنیا میں اشتہار کے ذریعے سب کچھ ہو سکتا ہے اور پھر عورتوں کا عطر مس پیریمادتی تم خود خیال کرو۔ کونسا مرد ہے جو عورتوں کا عطر خریدنا پسند نہ کرے گا۔ مجھے افسوس تو یہی ہے کہ مردوں کے جسم سے ویسی خوشبو نہیں نکلتی۔ ورنہ عورتوں کا عطر مردوں کے لئے اور مردوں کا عطر عورتوں کے لئے بیچتا۔ اور دُوگنا فائدہ اٹھاتا۔ خیر! اسے کیا کیجیے جو کام نہیں ہو سکتا۔ فی الحال میں نے کمپنی کے پراسپکٹس چھپنے کے لئے دے دیئے ہیں۔ اگلے ہفتے کمپنی تیار ہو جائے گی۔ اور اس کے سب حصے میرے اور میرے رشتہ داروں کے ہوں گے چند اشتہاروں کے خاکے بھی میں نے سوچ لئے ہیں۔ پانڈیا تم صلاح دو یہ اشتہار کیسا رہے گا۔؟

"اب کنواریوں کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔

کنواری لڑکیوں کا عطر استعمال کیجیے"۔ اور یہ —

"شادی کے اخراجات سے بچئے۔ صرف عورتوں کا عطر استعمال کیجیے"۔

"دیکھئے ہمارے ملک میں ہزاروں لاکھوں نوجوان ایسے ہیں جو اپنے اقتصادی حالات سے مجبور ہو کر شادی نہیں کر سکتے اور بدچلنی اور بے راہ روی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں ان سب کے لئے عورتوں کا عطر بہترین رہے گا بس ذرا سا عطر اپنے کپڑوں پر لگا لیا اور عورت کی خوشبو سے جھومتے جھامتے سینما دیکھنے چلے گئے۔

کیوں کیا خیال ہے میں تو سوچتا ہوں میں فضول اس فلم کمپنی کے چکر میں کیوں پڑوں صرف یہ عطر بنانے کا کارخانہ ہی کیوں نہ کھول لوں"۔

"ایسا نہ کیجیے"، پانڈیا افسانہ نگار نے بے اختیار ہو کے کہا: "غضب ہو جائے گا"۔

"کیا غضب ہو جائیگا"؟ "ارے سیٹھ صاحب آپ کی فلم کمپنی سے آپ کو لاکھوں کا فائدہ ہونے

والا ہے۔"

"وہ کیسے ؟"

"دیکھیے۔ آرک لیمپ آپ اپنے کارخانے میں استعمال کریں گے وہی آرک لیمپ ہماری فلم کمپنی میں بھی استعمال ہوں گے۔ فلم بنانے کے لئے آرک لیمپوں کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ بس پھر اُدھر کارخانے میں عورتوں کا عطر نکلوایئے اُدھر فلم کمپنی میں فلم ایکٹریسوں کا عطر نکلوایئے۔ نرگس کا عطر، مدھوبالا کا عطر نلنی جیونت کا عطر، میں کہتا ہوں آپ اسے ہندوستان تک ہی کیوں محدود رکھیں۔ آپ ایک بین الاقوامی نام بنایئے۔ گریٹا گاربو کا عطر نکلوایئے۔ بھگوان کی قسم کھا کے کہتا ہوں۔ ایک لاکھ روپے میں بکے گا۔ فلمیں الگ تیار ہوں گی اور فلم بناتے وقت تیز روشنی کے سامنے کھڑے ہو کے جو پسینہ نکلے گا۔ اس سے عطر تیار ہو گا۔ ایک پنتھ دو کاج۔ لوگ بھی خوش۔

نرگس کی تصویر دیکھنے جا رہے ہیں۔ نرگس عطر لگا کے مدھوبالا کی پکچر دیکھنے جا رہے ہیں، مدھوبالا کا عطر لگا کے ابھی اسی دن میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔ کہ مدھوبالا کا ایک نادار عاشق اپنے دوستوں میں مدھوبالا کا نام رٹتا رٹتا مر گیا۔ اگر اسے مدھوبالا کا عطر دستیاب ہو جاتا تو مدھوبالا نہ سہی مدھوبالا عطر ہی سہی وہ بیچارہ اسی پر قناعت کر لیتا۔ ایک غریب کی جان تو بچ جاتی۔ میں تو کہتا ہوں سیٹھ جی۔ آپ یہ کمپنی کھول کر قوم پر احسان کریں گے۔ ہزاروں نوجوانوں کی زندگیاں بچائیں گے۔ لاکھوں نوجوانوں کو بداخلاقی سے بچائیں گے۔"

سیٹھ موہن لال بک بیرنے اپنی چیک بک سے دو ہزار کا ایک اور چیک

پھاڑ کر نرد تم بھائی پانڈیا کے ہاتھ تھما دیا۔ اور کہا۔

"تم نے بہت اچھا خیال دیا ہے۔ ایک دم نیو آئیڈیا۔ ہم بہت خوش ہیں۔ ہم تمہیں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیں گے۔"

پانڈیا نے چیک جیب میں رکھ کر کہا۔

"سیٹھ صاحب ایک اور آئیڈیا آیا ہے آپ عورتوں کو ملازم تو رکھ ہی رہے ہیں تو اسی کارخانے میں کئی اور ضمنی فائدے بھی ہو سکتے ہیں۔"

"مثلاً"

"مثلاً یہ کہ عورتوں کے آنسوؤں کو منجمد کر کے عورتوں کی قلفی تیار کر سکتے ہیں آنسوؤں میں سے نمک الگ کر کے عورتوں کا نمک بازار میں بیچ سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ......"

"ہاں، ہاں ہو تو سکتا ہے لیکن یہ قیمتی تجارتیں ہیں۔" سیٹھ صاحب نے کہا۔
"ان سے بھی کچھ ضمنی فائدے ہو سکتے ہیں۔ چلو ان پر ہم کچھ کمیشن بھی دے دیں گے۔" "آپ کی بڑی عنایت ہے۔" افسانہ نگار نے بڑے مسکین لہجے میں کہا۔
یہ پاروتی جو اب تک چپ بیٹھی تھی فکر مند نگاہوں سے سیٹھ کی طرف دیکھ کے بولی۔
"ظاہر ہے کہ آپ اس کارخانے میں صرف کنواری لڑکیوں کو ملازم رکھیں گے۔"

"ہاں کیونکہ خوشبو تو صرف ان ہی کے پسینے سے نکلتی ہے۔"

"لیکن اگر کوئی شادی کر لے تو۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میرے کارخانہ کی کوئی لڑکی شادی نہیں کر سکے گی پہلے تو میں یہ کارخانہ صرف ہندوستان میں بناؤں گا، لیکن بعد میں دوسرے ملکوں میں کھولوں

گا۔ امریکہ میں برطانیہ میں فرانس میں۔ وہاں ان ملکوں میرے عطر کی بہت قدر ہو گی۔ لیکن یہ شرط تو میں ہر جگہ رکھوں گا۔ کہ ہمارے کارخانے میں کام کرنے والی لڑکیاں کبھی شادی نہیں کر سکیں گی۔"

"تو آپ دنیا کی لاکھوں عورتوں کو شادی سے محروم کر دیں گے۔"

"کیا کریں۔ بزنس۔ بزنس ہے۔"

مس پردیپاوتی آپ ہی آپ مسکرانے لگی۔

"کیوں مسکرا رہی ہو" سیٹھ موہن لال نے پوچھا۔

"کچھ نہیں جی" پردیپاوتی آہستہ سے بولیں "یونہی کچھ سوچ رہی تھی۔"

تھوڑی دیر کمرے میں سناٹا رہا۔ پھر سیٹھ صاحب ہنس کر بولے۔ "بھئی اور تو سب ٹھیک۔ لیکن آج کل سائنس کا زمانہ ہے سب تحقیقات کر لینی چاہئے اچھی طرح جانچ پڑتال کر لینی چاہئے۔ کہ کس قسم کی لڑکی میں کیسی خوشبو ہوتی ہے کس عمر میں یہ خوشبو زیادہ ہوتی ہے۔ کس عمر میں کم ہوتی ہے ضروری باتوں کو دریافت کرنے کے لئے میں نے ایک سائنس دان سے بات کی ہے وہ نیشنل لیبارٹری میں پانچ سو کا ملازم تھا میں نے دو ہزار مہینہ دے کر ٹھیک کر لیا ہے ڈاکٹر عبدالحفیظ اس کا نام ہے۔ نوجوان ہے۔ پی ایچ۔ ڈی ہے۔ محبت سے کام کرے گا۔ باہر کمرے میں بیٹھا ہے۔" پانڈیا کچھ کہنے ہی والا تھا کہ پردیپاوتی نے جلدی سے کہا "اسے اندر بلا لیجئے نا" سیٹھ نے گھنٹی بجائی اور سائنس دان کو اندر بلا لیا اور اسے سب بات اچھی طرح سے سمجھا دی۔

ڈاکٹر عبدالحفیظ نے کہا۔ اس تحقیقات میں چھ مہینے تو ضرور لگ جائیں گے۔

سیٹھ نے چلا کے کہا "آپ کیا بات کرتے ہیں میں پر اسپکٹس چھپوا رہا ہوں

کمپنی کے حصے بیچ رہا ہوں۔ کمپنی کے کارخانے کے لئے مشینری کا آرڈر دے رہا
ہوں اور آپ چھ مہینے تحقیقات میں لگائیں گے جب تک میں انتظار نہیں کر سکتا۔
صرف تین مہینے کافی ہیں تین مہینے کے بعد آپ اسی دفتر میں مجھے ملئے یہ لیجئے تین مہینے
کی تنخواہ" سیٹھ نے چھ ہزار روپے کا چیک سائنس دان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ سائنس داں
ہاتھ جوڑ کے رخصت ہو گیا۔

پورے تین مہینے بعد ڈاکٹر عبدالحفیظ نے سیٹھ کے دفتر کی گھنٹی بجائی سیٹھ نے
اسے فوراً اندر بلا لیا۔ سیٹھ سائنس داں کو دیکھ کے حیرت میں آ گیا۔ سائنس داں کی
آنکھوں کے نیچے گڑھے پڑے ہوئے تھے اس کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اور آدھے
سے زیادہ بال سفید ہو چکے تھے۔

"یہ آپ کو کیا ہوا؟" سیٹھ نے حیرت سے پوچھا۔

مس پریماوتی اور پانڈیا بھی حیران ہو کر سائنس دان کی صورت دیکھنے لگے۔

ڈاکٹر عبدالحفیظ نے کہا۔ یہ سب کچھ آپ کی تحقیقات کے سلسلے میں ہوا۔ جس
دن آپ نے مجھے یہ کام سونپا۔ بس اسی دن سے تحقیقات میں لگ گیا سب سے
پہلے تو میں نے یہ سوچا کہ یہ تحقیقات کرنی چاہئے۔ کہ عورتوں کے پسینے میں کیسی خوشبو
ہوتی ہے۔ اس کے لئے میں نے سب سے پہلے فلم ایکٹریسوں کی طرف رجوع
کیا۔ اور نرگس کا پسینہ سونگھنے کی کوشش کی۔ جب وہ سیٹ پر کام کر رہی تھی۔
کمبخت نے کچھ سوچا نہ سمجھا میرے گال پر زور سے ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ پھر وہ
طمانچہ کھا کے میں مدھوبالا کے یہاں گیا لیکن اس نے مجھ سے ملاقات کرنے سے

انکار کر دیا۔ اسی طرح دوسری فلم ایکٹریسوں نے بھی میری بے عزتی کی۔ پھر بھی میں چند فلم ایکٹریسوں کا پسینہ سونگھنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان کی رپورٹ میری فائل میں موجود ہے۔ اس کے بعد میں عام کنواری لڑکیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ لیکن یہ مصیبت ہوئی کہ جونہی میں ان کا پسینہ سونگھنے کی کوشش کرتا۔ وہ چپل اتار کر کھڑی ہو جاتیں۔ ایک دفعہ بازار میں چلتے ہوئے۔ ایک لڑکی کو سونگھنے کی کوشش کرتے ہوئے پولیس نے مجھے پکڑ لیا۔ ایک ہفتہ حوالات میں رکھا۔ مجسٹریٹ نے مجھے ایک مہینہ نو دن کی سزا دی۔ ابھی سیدھا جیل سے یہاں آ رہا ہوں۔

لیکن پھر بھی ان تمام تکلیفوں کے باوجود میں نے اپنی رپورٹ مکمل کر لی ہے اب تک میں نے کوئی چھ سو کنواری لڑکیوں کے پسینے سونگھے ہیں اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ.....!"

"کہ......؟" سیٹھ نے بہت ہی بے چینی سے پوچھا۔

"کہ عورتوں کے پسینے میں خوشبو ہوتی ہی نہیں"۔

"باپ رے!" سیٹھ زور سے چلایا۔

"نہ کنواری لڑکیوں کے پسینے میں نہ شادی شدہ لڑکیوں کے پسینے میں۔ خوشبو ہوتی ہی نہیں بلکہ ان کے پسینے میں بھی اسی طرح بدبو ہوتی ہے۔ جس طرح مردوں کے پسینے میں۔ پھر میں نے اس بدبو کی تحقیقات کرنا چاہی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

"لیکن میں نے تو تمہیں خوشبو کی تحقیقات کے لئے مقرر کیا تھا نہ کہ بدبو کی تحقیقات کے لئے"۔

"یہ درست ہے لیکن میں نے سوچا اگر بدبو کا پتہ چل جائے تو ممکن ہے خوشبو لانے کی صورت نکل آئے لیکن اس میں بھی مجھے ناکامی ہوئی کیونکہ عورت کے

پسینے میں جو اجزا موجود ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔

عورت کا پسینہ مساوی ہے. گندہ پانی. چند زہریلے مادے۔ امونیا۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ، سوڈیم کلورائڈ وغیرہ۔

اور ان میں سے کسی سے خوشبو نہیں نکل سکتی۔

"ارے لوگو میں تو لٹ گیا" سیٹھ نے اپنی چھاتی پر دو ہتڑ مار کر کہا۔

"میں نے کارخانہ کی عمارت کا ٹھیکہ بھی دے دیا ہے. دو کروڑ روپے میں"

"ٹھیریے. ٹھیریے" مس پریا دتی نے تسلی دیتے ہوئے کہا اور پھر وہ ڈاکٹر عبدالحفیظ کی طرف بڑے اطمینان سے مڑ کر بولی "ڈاکٹر اگر عورتوں کا عطر نہیں بن سکتا تو نہ سہی۔ عورتوں کے آنسوؤں کا نمک تو بن سکتا ہے"

"اس کی بھی میں نے تحقیقات کر لی ہے" ڈاکٹر نے نہایت یقین سے کہا یہ نمک ضرور بن سکتا ہے. لیکن میں نے اندازہ کیا ہے کہ یہ کوئی نفع بخش سودا نہیں ہے کیونکہ میں نے اندازہ کیا ہے کہ اگر ایک لاکھ عورتوں کو ایک سال تک رلایا جائے تو ان کے آنسوؤں سے صرف ایک چھٹانک نمک دستیاب ہو گا"

"ارے میں تو بالکل لٹ گیا۔ برباد ہو گیا اب تو اس کارخانے سے کسی ضمنی فائدے کی بھی امید نہیں رہی۔ ارے پانڈیا کے بچے نمک حرام تو نے میری لٹیا ہی ڈبو دی۔ اور تم بھی سائنس داں بڑے سائنس داں بنے پھرتے ہو۔ نکل جاؤ تم دونوں اسی وقت میرے کمرے سے نکل جاؤ. پانڈیا اور سائنس داں دونوں وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئے، کمرے میں صرف پریا دتی اور سیٹھ صاحب رہ گئے مس پریا دتی رہ رہ کر مسکراتی جاتی تھیں۔

سیٹھ نے غصے میں آ کے پوچھا

"تم کیوں مسکرا رہی ہو؟"

"یونہی کچھ سوچ رہی تھی!"

"کیا سوچ رہی تھیں ؟"

مس پردیپاوتی نے مسکرا کر کہا "یہی کہ اچھا ہوا قدرت نے عورتوں کے جسم میں خوشبو نہیں رکھی ورنہ آپ سرمایہ دار لوگ تو........!"

ہماری مطبوعات

ناقابلِ فراموش	دیوان سنگھ مفتوں	پنجرہ	امرتا پریتم
کارِ جہاں دراز ہے	قرۃ العین حیدر	انچاس دن	"
آشفتہ بیانی میری	رشید احمد صدیقی	رنگ کا پتہ	"
رسیدی ٹکٹ	امرتا پریتم	ایک تھی انیتا	"
پیغمبرانِ سخن	سردار جعفری	ڈاکٹر دیو	"
ویسے صورتیں الٰہی	مالک رام	بلاوا	"
ساحر شخص و شاعر	ناز صدیقی	دو ہاتھ	عصمت چغتائی
آگ کا دریا	قرۃ العین حیدر	بدن کی خوشبو	"
سیتا ہرن	"	افسانے ڈرامے	"
ماں کی کھیتی	"	ایک لڑکی ایک جام	امرتا پریتم
آدمی کا مقدر	"	پھول کی تنہائی	کرشن چندر
ڈنگو	"	محبت کی رات	"
آلیس کے گیت	"	نئے غلام	"
تلاش	"	بلونت سنگھ کے افسانے	بلونت سنگھ
کٹاری	سعادت حسن منٹو	ٹھنڈا گوشت	سعادت حسن منٹو
ایک گدھے کی سرگزشت	کرشن چندر	انار کلی	"
الٹا درخت	"	کالی شلوار	"
وادر پل کے بچے	"	خالی بوتلیں خالی ڈبے	"
میری یادوں کے چنار	"	گنجے فرشتے	"
رات چور اور چاند	بلونت سنگھ	لاؤڈ سپیکر	"
چک پیراں کا جسّا	"	نیچے اوپر اور درمیان	"
ناگ منی	امرتا پریتم	پت جھڑ کی آواز	قرۃ العین حیدر
یہ سچ ہے	"	فصلِ گل آئی یا اجل آئی	"

مکتبہ اُردو ادب